دائرۃ المعارف

یعنی

معارف اعظم گڈھ

کی

۶۱ ویں جلد

ازجنوری سنہ ۱۹۴۸ تا جون سنہ ۱۹۴۸

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

مطبوعہ معارف پریس اعظم گڈہ

فہرست مضمون نگاران معارف

جلد ۶۱

جنوری ۱۹۴۸ء تا جون ۱۹۴۸ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

شمار	اسمائے گرامی	صفحہ	شمار	اسمائے گرامی	صفحہ
۱	مولانا ابوالجلال صاحب ندوی رفیق دارالمصنفین	۳۰۵	۷	جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب ایم اے (علیگ)	۲۱، ۱۰۰، ۲۱۰
۲	جناب مولوی ابوالطیب عبدالرشید صاحب لاہور،	۱۳۰	۸	جناب مولانا عبدالباری ندوی	۱۶۵-۲۴۵، ۳۲۵-۴۰۵
			۹	لیفٹنٹ کرنل جناب خواجہ عبدالرشید صاحب	۴۵۲
۳	جناب مولوی ابو یحییٰ امام خان صاحب نوشہروی	۵۱	۱۰	مولانا عبدالسلام ندوی	۵-۸۵
			۱۱	جناب مولوی حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی رفیق دارالمصنفین	۳۸، ۲۲۲،
۴	جناب مولوی حیدر زمان صاحب صدیقی فاضل دیوبند	۱۱۵، ۱۹۲	۱۲	جناب مولوی محمد عزیر صاحب ایم اے لکچرار اردو مسلم یونیورسٹی علیگڈھ	۲۹۲، ۳۵۱
۵	مولانا ریاست علی صاحب ندوی	۴۳، ۲۲۶، ۲۶۵			
۶	سید سلیمان ندوی	۲۲۹، ۲۳۳، ۳۰۱، ۳۸۰، ۳۹۰، ۳۹۳	۱۳	جناب محمد مظہرالدین صاحب صدیقی بی اے،	۲۷۵، ۳۷۲، ۴۳۴،

فہرست مضامین

جلد ٦١

جنوری ١٩٤٨ء تا جون ١٩٤٨ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

جلد ۶۱ ماہ صفر المظفر ۱۳۶۷ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۴۸ء عدد ۱

مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

قومی اور جمہوری حکومت نے اردو زبان کے ساتھ چند مہینون مین جو سلوک کیا وہ غیر ملکی اور مستبد حکومت چند صدیون مین بھی نہ کر سکی تھی، اور اس کے جواز کے لئے جو دلیل پیش کیجاتی ہے، اس کو نہ منطق سے واسطہ ہے نہ سچائی سے، اسے کون منصف مزاج یقین کر سکتا ہے، کہ صوبہ متحدہ کی اکثریت کی زبان ہندی، اور اردو صرف مو تیصدی کی زبان ہے، یہان تک تو تسلیم کیا جا سکتا ہو کہ علمی و ادبی اردو، عام بول چال کی زبان اور شہری اور دیہاتی زبان مین فرق ہے، لیکن صرف عربی و فارسی الفاظ کی آمیزش، تلفظ کی صحت و شائستگی اور لب و لہجہ کا کوئی ایسا بنیادی فرق نہین ہے جس کی بنا پر ان زبانون کو بھی مختلف زبانین کہا جائے، چہ جائیکہ ان کو ہندو مسلم زبانین قرار دیا جائے، زبان کی یہ تقسیم بالکل نئی ہے شہر کے باشندون کی زبان خواہ وہ ہندو ہون یا مسلمان، اسی طریقہ سے دیہات کے تمام باشندون کی زبان بالکل ایک ہی، عام بول چال کی زبان ہندو مسلمان یکسان بولتے اور سمجھتے ہین، اور اسکے مقابلہ مین جو زبان گڑھی جا رہی ہے، اسے نہ صرف مسلمان بلکہ وہ ہندو بھی نہین سمجھتے جو سنسکرت سے ناواقف ہین اگر ہندی ہوتی تو بھی غنیمت تھا

اردو نہ صرف اس لئے کہ ہندو مسلمانون کی مشترک زبان ہے، بلکہ علمی لسانی، سیاسی اور تمدنی کسی حیثیت سے بھی کوئی ہندوستانی زبان اس کے مقابلہ مین حکومت کی زبان بننے کی صلاحیت نہین رکھتی، وہ خالص ہندوستان کی پیداوار ہے، اس مین ہندو مسلم دونون کلچرون کے عناصر یکسان ہین اس کی زمین تمام تر ہندی اور پراکرت کی ہے، صرف گل بوٹے فارسی اور عربی کے ہین اس کے قاعدے، مادے، مصادر، اور اکثر نام محاورے اور اصطلاحین ہندی اور پراکرت وغیرہ کی ہین، صرف وہ اسماء اور اصطلاحین جو ہندوستانی زبانون مین نہ تھین، یا ان کے مقابلہ مین عربی اور فارسی کی ان سے زیادہ خوبصورت اور زبان کے لئے قابل قبول تھین ان دونون زبانون کی ہین، اور ان مین بیشتر الفاظ وہ ہین جو

اتنے چڑھ چکے ہین جنھین ایک دیہاتی بھی آسانی کو سمجھتا ہو زمینداری، کاشتکاری، مقدمہ عدالت اور حکومت کے مختلف شعبون کے متعلق عربی اور فارسی کی جس قدر اصطلاحین ہین، انھین کون دیہاتی نہین سمجھتا، اردو مین ہندوستان کی پرانی زبانون کے الفاظ کے مقابلہ مین عربی اور فارسی الفاظ کا تناسب چوتھائی سے بھی کم ہے، اس مین ہندو کلچر اور ہندوستان کے مقامی اثرات بھی پوری طرح موجود ہین، اس کی تفصیل مین پڑنے کا یہ موقع نہین ہے، راقم نے کئی سال ہوئے ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کے اجلاس مین اس موضوع پر ایک مفصل مقالہ پڑھا تھا، جو اکیڈمی کے رسالہ کے کئی نمبرون مین چھپ چکا ہے،

اردو گو ہندو مسلم عوام کے اختلاط سے پیدا ہوئی لیکن اس نے حکومت کی گود مین پرورش پائی، اور ایک عرصہ تک ہندو مسلمان ادیبون اور اصحاب علم و قلم کی تصنیفی زبان رہ چکی ہے، اور اب بھی ہے اس نے ہندوستان کی اکثر پرانی زبانون اور عربی فارسی اور ترکی وغیرہ بیرونی زبانون کے بہترین عناصر کو جذب کیا ہے اس لئے اس مین جو وسعت ہے اور علوم و فنون اور حکومت و تمدن کے ہر شعبہ اور ہر شاخ کے متعلق جس قدر الفاظ اور اصطلاحین اردو مین موجود ہین، وہ ہندوستان کی کسی زبان مین بھی نہین مل سکتین، انگریزی حکومت اور مغربی تمدن نے جو نئی چیزین پیدا کین، ان کے مترادفات بھی اردو مین بن گئے، یا اصل زبان کے جو الفاظ اس مین کھپ سکتے تھے، وہ اس مین جذب ہو کر اردو کا جزبن گئے، اور آج کوئی نیا لفظ ایسا نہین ہے جس کا مرادف اردو مین موجود نہ ہو، ان مین اکثر زبانون پر چڑھکر عام ہو چکے ہین، سیاسی حیثیت سے بھی اردو کی کچھ کم اہمیت نہین، ایشیا کے اکثر ملکون خصوصاً ہندوستان کے پڑوسی اسلامی ممالک مین ہر جگہ کم و بیش اردو کے سمجھنے والے موجود ہین، ایشیا کے جن ملکون مین بھی مسلمانون کی قابل لحاظ آبادی ہے، ان مین اردو نامانوس نہین اس لئے تمام ہندوستانی زبانون مین ان ملکون سے ربط و تعلق کا ذریعہ بھی اردو ہی ہو سکتی ہو سنسکرت اور ہندی صرف ہندوستان کے اندر محدود ہے،

اردو زبان کا مسئلہ ایسا متفق علیہ جس پر نہ صرف ہر مسلک و خیال کے مسلمان بلکہ سنجیدہ اور صحیح الخیال

ہندو بھی متحد ہیں، گاندھی جی کی رائے سب کو معلوم ہے، حال ہی میں لکھنؤ میں آل انڈیا اردو پریس، اور آل انڈیا انجمن ترقی پسند مصنفین کی جو کانفرنسیں ہوئی ہیں، ان میں ہندو اخبار نویسوں اور ادیبوں نے بھی بالاتفاق اردو کی حمایت، اور حکومت کے رویہ پر ناپسندیدگی ظاہر کی ہے، انجمن ترقی پسند مصنفین کی جانب سے اردو کی حمایت میں جو اعلان شائع ہوا ہے، اس میں مسلمانوں سے زیادہ ہندوؤں اور سکھوں کے نام ہیں، انفرادی طور پر بھی بہت سے ممتاز ہندوؤں نے اردو کی تائید میں بیانات دیئے ہیں، اور اس جماعت کے علاوہ جو برابر بھارت کو زندہ کرنا چاہتی ہے، حق پسند ہندو بھی اردو کے ساتھ حکومت کی روش کو پسند نہیں کرتے،

کانگریس ایک طرف تو بلا اختلاف مذہب و ملت ہندوستان کے تمام فرقوں کی نمایندگی، ان کے کلچر کے تحفظ اور متحدہ قومیت کی مدعی ہے، دوسری طرف اردو کے ساتھ جو ہندو مسلمانوں کے میل جول کی پیداوار اُن کے اتحاد کی نشانی، دونوں کے مشترک کلچر کا سب سے بڑا نمونہ اور اس کی امین و محافظ ہے، کانگریسی حکومت کا یہ طرزِ عمل نہایت حیرت انگیز ہے، اگر اردو تنہا مسلمانوں کی زبان بھی ہوتی، تو بھی ایک جمہوری ادارہ کی حیثیت سے اردو کا تحفظ کانگریس کا فرض تھا، زبان زبردستی پیدا نہیں کیجاتی، بلکہ طبعی اور فطری پیدا ہوتی، اور بڑھتی ہے، اس لئے اردو کے مقابلہ میں نئی زبان کا فروغ پانا آسان نہیں ہے، اور ایک نہ ایک دن حکومت کو اردو کا واجبی حق ماننا پڑے گا،

مولانا عبد الماجد صاحب ظلہ دریابادی کی مشہور و مقبول کتاب تصوف اسلام کا تیسرا اڈیشن چھپ کر تیار ہو گیا ہے، گو اس کے ابواب میں کوئی نیا اضافہ نہیں ہے، لیکن بعض ابواب کے مباحث میں مفید اضافے اور پوری کتاب میں جزوی ترمیمیں کی گئی ہیں، اور یہ نیا اڈیشن پہلے اڈیشنوں سے زیادہ جامع اور مکمل ہو گیا ہے، یہ کتاب اردو میں قدیم اکابر صوفیائے کرام کی تصانیف کا جو تصوف کی امہات کتب اور روح شریعت ہیں، خلاصہ اور عطر ہے، اور مصنف کے قلم سے ان کی ضروری تشریح و توضیح ہے، اصحاب ذوق دار المصنفین سے طلب فرمائیں،

مقالات

اسلامی طب کی مختصر تاریخ

از

مولانا عبد السلام ندوی

اسکندر اعظم نے جب مشرق میں فاتحانہ اقتدار حاصل کیا، تو سیاسی مصالح کی بنا پر معاشرتی، تمدنی اور علمی حیثیت سے یونان اور مشرق کے مفتوحہ ممالک میں ربط و علاقہ پیدا کرنا چاہا، اور اس غرض سے مشرقی ممالک میں یونانیوں کو آباد کیا، اور یونان کے علماء و فضلاء کو یونانی علم و ادب کی اشاعت کی ترغیب دلائی، جو یونانی حکام اسکندر کی طرف سے ان ممالک میں مقرر تھے، انھوں نے بھی اس کی تقلید کی، اور اس طرح مشرقی ممالک میں یونانی تمدن اور یونانی علوم عام طور پر پھیل گئے، اور اسلام سے پہلے اور اسلام کے بعد مشرق کے بہت سے شہر یونانی علوم و فنون کے مرکز بن گئے، جن میں اسکندریہ، جندیسابور اور حران کو خاص طور پر اہمیت حاصل تھی، ان میں اسکندریہ کے اسکول نے طب کیمیا اور علوم طبیعیہ میں زیادہ شہرت حاصل کی اور اسلامی فتح کے زمانہ تک اس کی یہ شہرت قائم تھی، اور مسلمان سب سے پہلے اسی اسکول سے آشنا ہوئے، کیونکہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب اسکندریہ فتح ہوا، تو اس وقت اسکندریہ کا سب سے بڑا فلسفی یحیٰی نحوی زندہ تھا، اور جب حضرت عمرو بن العاص نے مصر اور اسکندریہ کو فتح کیا، تو وہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور وہ اس کے علم و فضل کے اس قدر گرویدہ ہوئے کہ اس کو اپنا ہمدم و ہم نشین بنا لیا، اس کے بعد

شہرزوری کی روایت کے مطابق حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ تک زندہ رہا اور خالد بن یزید الاموی سنہ ۸۵ھ نے اس سے طب کی تعلیم حاصل کی۔ ۱؎

اسکندریہ کا سب سے زیادہ مشہور طبیب اصطفن تھا جس نے خالد بن یزید کے لئے کیمیا وغیرہ کی بہت سی کتابوں کا ترجمہ کیا، ۲؎

اسکندریہ کا ایک اور طبیب عبد الملک بن ابجر کنانی تھا جس نے حضرت عمر بن عبد العزیزؓ کے ہاتھ پر ان کی گورنری کے زمانہ میں اسلام قبول کیا، اور وہ طب میں ان کا معتمد خاص بن گیا، ۳؎ لیکن اسکندریہ اسکول کا اثر صرف بنو امیہ کے زمانہ تک قائم رہا اور خلفاء عباسیہ کے دور حکومت تک تجاوز نہ کرسکا، عباسی دور میں اسکندریہ کے صرف ایک عیسائی طبیب بلیطیان کے نام کا پتہ چلتا ہے جو منصور کی خلافت کے چوتھے سال اسکندریہ کا پادری مقرر ہوا، اس کے بعد خلیفہ ہارون رشید نے اپنے دور خلافت میں عبید اللہ بن مہدی کو مصر کا گورنر مقرر کیا، تو اس نے اس کی خدمت میں ایک نہایت حسین وجمیل کنیز ہدیۃً بھیجی، جس پر وہ فریفتہ ہوگیا، اتفاق سے وہ ایک بار سخت بیمار پڑی، اور اطباء کے علاج سے کچھ فائدہ نہ ہوا، تو لوگوں نے ہارون رشید کو مشورہ دیا کہ مصر سے کسی طبیب کو بلوائیے وہ اطباء عراق سے بہتر اس کا علاج کرسکے گا، ہارون رشید نے اس کے لئے عبید اللہ بن مہدی کو لکھا اور اس نے اس کے لئے بلیطیان کا انتخاب کیا، بلیطیان مصر سے روانہ ہوا تو مصر سے چند دوائیں بھی ساتھ لیتا آیا اور بغداد میں پہنچ کر کنیز کو یہ دوائیں کھلائیں، تو وہ بالکل صحیح وتندرست ہوگئی، ۴؎

بلیطیان کے سوا عباسی دور میں اسکندریہ کے اور کسی طبیب کا نام نہیں ملتا، بلکہ عباسی دور میں سب سے

۱؎ شہرزوری نے یحییٰ نحوی کا تذکرہ دو جگہ لکھا ہے، ایک جگہ وہ اس کو اسکندرانی اور دوسری جگہ دیلمی کہتا ہے لیکن درحقیقت یہ دونوں ایک ہی ہیں ۲؎ فہرست ابن ندیم مطبوعہ مصر ص ۴۹۰ ۳؎ طبقات الاطباء جلد اول ص ۱۱۵ ۴؎ ایضاً جلد دوم ص ۹۲، ۱۰۳

زیادہ اثر جندیسا پور کے اسکول کا ہوا، جہاں نہایت قدیم زمانہ سے ایک طبی درسگاہ موجود تھی، جس کو نوشیرواں نے قائم کیا تھا، اور اس میں یونانی علوم وفنون آرامی زبان میں پڑھائے جاتے تھے، اور یونانی علوم وفنون کے ساتھ پہلوی زبان میں ہندی علوم وفنون کی تعلیم بھی ہوتی تھی، اور بعض ہندو اس خدمت کو انجام دیتے تھے،

علامہ جمال الدین قفطی نے اخبار الحکماء میں اس شہر کے آباد ہونے کی جو تاریخ لکھی ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شہر کیونکر یونانی علوم وفنون بالخصوص فن طب کا مرکز بن گیا، وہ لکھتا ہے کہ جندیسا پور کے اطباء نے اکاسرہ کے زمانہ سے فن طب میں مہارت حاصل کی اور اس کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ سابور بن اردشیر نے جب انطاکیہ اور شام کو فتح کیا، تو اس نے فیلیب قیصر روم سے اس شرط پر مصالحت کی کہ وہ اپنی لڑکی کی شادی اس کے ساتھ کر دے، قیصر روم نے اس شرط کو منظور کرلیا، لیکن لڑکی کے آنے سے پہلے سابور نے اس کے لئے قسطنطنیہ کی شکل کا ایک شہر تعمیر کیا، جس کا نام جندیسا پور رکھا، شہر کے آباد ہونے کے بعد جب قیصر روم کی لڑکی اس میں آئی، تو روم سے ہر قسم کے ضروری اشخاص بھی اس کے ساتھ آئے، جن میں بہت سے حذاق اطباء بھی تھے، ان اطباء نے اس شہر میں قیام کیا تو وہاں کے نوجوانوں کو فن طب کی تعلیم دینی شروع کی، اور انھوں نے رفتہ رفتہ اس فن میں اس قدر ترقی کرلی کہ تمام لوگوں سے ممتاز ہوگئے، اور ایک جماعت کے نزدیک ان کا طریقۂ علاج یونان اور ہندوستان کے طریقۂ علاج سے بھی بڑھ گیا، کیونکہ انھوں نے ہر گروہ کی نمایاں خصوصیات کو لیکر اپنے استنباطات سے ان میں بہت کچھ اضافہ کیا تھا، بہت سے اصول وقوانین مرتب کئے تھے، اور کتابیں تصنیف کی تھیں جن میں ہر قسم کی عمدہ باتیں جمع کی تھیں، ۱؎

اہل عرب پر اموی اور عباسی دور حکومت سے پہلے ہی اس اسکول کا اثر پڑنے لگا تھا،

۱؎ اخبار الحکماء قفطی، ص ۹۳،

چنانچہ عرب کے مشہور طبیب حارث بن کلدہ نے جو خود عہد رسالت میں تھا، زمانہ اسلام سے پہلے ہی فارس کا سفر کیا تھا، اور اہل جندیسا پور وغیرہ سے طب کی تعلیم حاصل کی تھی، حضرت سعد بن ابی وقاص حجۃ الوداع میں بیمار ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حارث ہی کے علاج کا مشورہ دیا، اور چونکہ وہ مسلمان نہ تھا، اس لئے اس واقعہ سے یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ طبی امور میں اہل کفر کے مشورہ سے فائدہ اٹھانا جائز ہے[1]،

اس کے بعد عباسی دور حکومت میں اہل جندیسا پور کا اثر و رسوخ خلیفہ منصور کے زمانہ میں خاص طور پر بڑھا جس کی وجہ یہ ہوئی کہ ۱۴۸ھ میں منصور کو معدہ کی شکایتیں پیدا ہوئیں، اور اطباء کے علاج کے باوجود روز بروز بڑھتی گئیں، بالآخر اس نے تمام اطباء کو جمع کرکے کہا کہ "میں تمام شہروں کے اطباء میں سے ایک ماہر طبیب کو بلانا چاہتا ہوں"، سب نے بالاتفاق جورجیس کا نام لیا، جو اس وقت جندیسا پور کا افسر الاطباء اور وہاں کے شفاخانے کا مہتمم تھا، منصور نے اس کو طلب کیا، اور وہ اپنے دو شاگردوں یعنی ابراہیم اور عیسیٰ ابن شہلا کے ساتھ بغداد میں آیا، اور ۱۵۲ھ تک منصور کا طبیب خاص رہا، اس کے بعد بیمار ہو کر اپنے وطن جندیسا پور کو واپس گیا، اور اپنے عوض منصور کے علاج کے لئے اپنے شاگرد عیسیٰ بن شہلا کو چھوڑ گیا، اس کے بعد خلیفہ مہدی کے زمانہ میں اس کا بیٹا ہادی بیمار ہوا، تو اس نے علاج کے لئے جندیسا پور سے جورجیس کے بیٹے بختیشوع کو طلب کیا، لیکن بعض اطباء کی دراندازی سے مہدی نے اس کو اعزاز کے ساتھ جندیسا پور میں واپس کر دیا، اور ۱۷۱ھ تک وہاں کے شفاخانے کا اہتمام کرتا رہا، پھر ہارون رشید درد سر میں مبتلا ہوا، تو اس نے اس کو دوبارہ طلب کرکے افسر الاطباء مقرر کیا[2]، اس کے بعد بختیشوع کے بیٹے جبرئیل نے جعفر بن یحییٰ بن خالد برمکی، اور ہارون رشید کی ایک کنیز کے علاج میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی، تو ہارون رشید نے اس کو پانچ لاکھ درہم

---

[1] اخبار الحکماء قفطی ص ۱۱۱، ۱۱۲، [2] اخبار الحکماء قفطی ص ۱۰۵، ۱۱۰، ۱۱۱،
[3] ، ، ، صفحہ ،،

عطا کئے، اور اس کو افسر الاطباء مقرر کر دیا[1]،

جندیسا پور اسکول کا ایک مشہور طبیب سابور بن سہل تھا، جو جندیسا پور کے شفاخانے میں مریضوں کا علاج کرتا تھا، متوکل اور اس کے بعد کے خلفاء کے درباروں میں اس کی بڑی قدر و منزلت ہوئی، اس نے ۲۵۵ھ میں خلیفہ مہتدی باللہ کے زمانہ میں وفات پائی[2]،

حرانی اسکول کا اثر ثابت بن قرہ حرانی کے ذریعہ سے قائم ہوا، جو ۲۲۱ھ میں حران میں پیدا ہوا، پھر بغداد میں آکر مستقل طور پر اقامت اختیار کر لی، حرانی اسکول میں ریاضیات و فلکیات نے سب سے زیادہ ترقی کی تھی، اور غالباً اس کی وجہ حرانیوں کی ستارہ پرستی تھی، اس نے محمد بن موسیٰ شاکر جو ریاضی و ہندسہ کا بڑا قدردان تھا، روم سے واپس ہوا تو ثابت کو ساتھ لیتا آیا، اور معتضد کے دربار میں اس کو منجمین کے زمرہ میں داخل کر دیا، اور اس کے زمانہ سے عراق میں صابئوں کا اثر و رسوخ بہت زیادہ بڑھ گیا[3]،

ثابت بن قرہ کے بعد اس کے بیٹے سنان بن ثابت نے طب و ہندسہ میں اپنے باپ کی طرح بہت زیادہ ناموری حاصل کی، اور پہلے مقتدر باللہ کا، پھر قاہر باللہ کا طبیب خاص مقرر ہوا، اور مقتدر باللہ نے اس کو افسر الاطباء مقرر کیا[4]،

سنان بن ثابت کے بیٹے ابراہیم بن سنان بن ثابت نے بھی علوم طبیہ بالخصوص علم ہندسہ میں بہت زیادہ شہرت حاصل کی، اور اس علم میں متعدد کتابیں لکھیں، وہ ۲۹۶ھ میں پیدا ہوا، اور ۳۳۵ھ میں وفات پائی[5]،

حران کا ایک مشہور طبیب ابو اسحٰق ابراہیم بن زہرون حرانی تھا، جس نے بغداد میں ۳۰۹ھ میں وفات پائی[6]،

ابراہیم بن زہرون حرانی کے بیٹے ابوالحسن ثابت بن حرانی نے بھی طب میں بہت زیادہ شہرت

---

[1] اخبار الحکماء قفطی ص ۹۲، ۹۳، [2] طبقات الاطباء جلد ا ص ۱۶۱، [3] اخبار الحکماء قفطی ص ۴۳، طبقات الاطباء جلد اول ص ۲۱۵ [4] اخبار الحکماء قفطی ص ۱۳۰ [5] اخبار الحکماء قفطی ص ۴۳، طبقات الاطباء جلد اول ص ۲۲۶،
[6] ایضاً ص ۲۴۷،

حاصل کی، وہ ۲۸۳ھ مین پیدا ہوا، اور ۳۳۵ھ مین بمقام بغداد انتقال کیا، علامہ ابن ابی اصیبعہ نے اس کی طبی مہارت کے متعلق بہت سے دلچسپ واقعات نقل کئے ہین [۵۱]،

ابراہیم بن ہلال صابی کے چچا ثابت بن ابراہیم نے بھی عضد الدولہ کے زمانہ مین طبی حیثیت سے اس قدر شہرت حاصل کی کہ ایک موقع پر اس کی نباضی کے کمال کو دیکھ کر ایک شخص نے صاف کہدیا کہ "یہ نبوت ہے طب نہین ہے"، وہ ۲۸۳ھ مین پیدا ہوا، اور ۳۶۹ھ مین وفات پائی [۵۲]،

ان کے علاوہ بعض ہند و طبیب بھی بغداد مین آئے، اور اپنے آثار علمیہ چھوڑ گئے، چنانچہ منکہ ہندستان سے خاص طور پر ہارون رشید کے علاج کے لئے آیا، اور ایک ہندوستانی طبیب شاناق نے زہرون کے متعلق جو کتاب لکھی تھی، اس کا ترجمہ ہندی زبان سے فارسی زبان مین کیا [۵۳]،

خلفاے اسلام کے دربارون مین ان غیر مسلم اطباء نے طبی ضرورتون سے جو رسوخ و اقتدار حاصل کیا، اُس سے قدرتی طور پر دو عمدہ نتیجے نکلے،

۱- ایک تو یہ کہ انہی غیر مسلم اطبا کے ذریعہ سے یونانی علوم و فنون کا ترجمہ ہوا، اور اوّل اوّل طبی کتابون کے ترجمے ہوئے، چنانچہ سب سے پہلے خالد بن یزید نے کیمیا و طب کی کتابون کے ترجمے کرائے، اس کے بعد مروانی دور حکومت مین ماسرجویہ یہودی نے اہرن قس کی قرابادین کا ترجمہ کیا، پھر منصور کے عہد مین جورجیس نے طبی کتابون کے ترجمے کئے، اس کے بعد خلیفہ ہارون رشید کے عہد مین، انگورہ، عموریہ، اور روم کے تمام شہرون پر فاتحانہ اقتدار حاصل ہوا، اور وہان طب کی بہت سی قدیم کتابین ملین تو ہارون رشید نے اُن کے ترجمہ کی خدمت یوحنا ماسویہ سے متعلق کی [۵۴]،

۲- دوسرا یہ کہ شفاخانون کا نظام جس کی بنیاد سب سے پہلے خلیفہ ولید بن عبد الملک نے ڈالی

[۵۱] طبقات الاطبا جلد اول ص ۲۲۰ [۵۲] اخبار الحکما قفطی ص ۸۰ [۵۳] طبقات الاطبا جلد دوم ص ۳۳ [۵۴] اخبار الحکما قفطی ص ۲۴۹،

تھی، بہت زیادہ وسیع و مکمل ہو گیا، اور متعدد شفاخانے قائم ہو گئے، عباسی دور مین خلیفہ ہارون رشید کے حکم سے جبرئیل بن بختیشوع نے ایک شفاخانہ قائم کیا، اور یوحنا بن ماسویہ کو جو اس کا سب سے بڑا شاگرد تھا، اس کا مہتمم مقرر کیا [۵۵]، اسی زمانہ مین ایک اور شفاخانہ خاندان برامکہ نے قائم کیا تھا جس کا افسر ایک ہندو طبیب ابن دہن نامی تھا [۵۶]، مقتدر باللہ نے ۳۰۶ھ مین سنان بن ثابت حرانی کے مشورہ سے ایک خاص شفاخانہ قائم کیا، جس کا نام شفاخانہ مقتدری تھا [۵۷]،

قیدیون اور دیہاتیون کے علاج کی طرف بھی اسی زمانہ مین توجہ ہوئی، اور ان کے لئے اطباء اور ڈاکٹر مقرر کئے گئے، چنانچہ ایک سال جب بکثرت وبائی امراض پھیلے، تو علی بن عیسیٰ نے جو مقتدر کا وزیر تھا، سنان بن ثابت کو لکھا، کہ قیدیون کی حالت خاص طور پر قابلِ توجہ ہے، اور اُن کے لئے مخصوص اطباء کے مقرر کرنے کی ضرورت ہے جو روزانہ تمام جیلخانون مین دوائین ساتھ لے کر جائین، اور ان کا علاج کرین، سنان بن ثابت نے اس حکم کی تعمیل کی، تو اس نے دوسرا فرمان لکھا کہ دیہاتیون کے علاج کا کوئی انتظام نہیں ہے، اُن کے لئے بھی مخصوص اطباء کے مقرر کرنے کی ضرورت ہے، جو اپنے ساتھ دوائین لے کر جائین، اور دیہاتون مین گھوم گھوم کر دیہاتیون کا علاج کرین، چنانچہ سنان بن ثابت نے اس حکم کی بھی تعمیل کی [۵۸]،

اس سلسلے مین مقتدر کے زمانہ مین سب سے بڑی ترقی یہ ہوئی، کہ طبیبون کے امتحان کا طریقہ قائم ہوا، چنانچہ ایک بار ۳۱۹ھ مین جب مقتدر کو معلوم ہوا کہ ایک طبیب کی غلطی سے ایک آدمی مر گیا ہے، تو اس نے اپنے محتسب کو حکم دیا کہ ہر طبیب کو علاج کرنے کی اجازت نہ دی جائے، صرف وہی طبیب علاج کر سکتے ہین جو سنان بن ثابت کے امتحان مین پورے اترین، چنانچہ امتحان کے لئے جو اطباء جمع کئے گئے، ان کی تعداد آٹھ سو سے زیادہ تھی، ان کے علاوہ جو مشہور یا شاہی اطباء تھے وہ امتحان سے مستثنیٰ تھے [۵۹]،

طبیبون کے ساتھ عطارون کی اصلاح و انتخاب کی بھی ضرورت تھی، اور عباسی دور مین اس طرف

[۵۵] اخبار الحکما قفطی ص ۲۵۰، ۲۵۱ [۵۶] فہرست ابن ندیم ص ۲۴۲ [۵۷] اخبار الحکما قفطی ص ۱۳۳ [۵۸] ایضاً ص ۱۳۲ [۵۹] ایضاً ص ۱۳۰،

سب سے پہلے مامون رشید کے زمانہ میں توجہ مبذول ہوئی، اور یوسف لقوہ نے مامون رشید سے شکایت کی کہ عطاروں سے جو دوائیں مانگی جاتی ہیں، خواہ اُن کے پاس ہوں یا نہ ہوں، مگر وہ یہی کہتے ہیں کہ یہ دوا ہمارے یہاں ہے اور اپنے یہاں سے کوئی نہ کوئی چیز اٹھا کر دیدیتے ہیں، امیر المومنین اگر چاہیں، تو خود اس کا تجربہ کرسکتے ہیں بغداد کے قریب ایک گاؤں تھا جس کا نام سقطیا تھا، مامون نے کچھ لوگوں کو عطاروں کے پاس بھیجا کہ سقطیا کے متعلق ان سے دریافت کریں کہ اُن کے پاس ہے یا نہیں، تمام عطاروں نے کہا کہ ہے، اور قیمت لے کر سب نے مختلف دوائیں دیدیں، اور یہ تمام لوگ مختلف دوائیں لے کر پلٹے، تو مامون نے یوسف لقوہ کے اس مشورہ کو پسند کیا، اسی نظیر کو پیش نظر رکھ کر زکریا طیفوری نے معتصم کے زمانہ میں افشین کو اس طرف توجہ دلائی، اور اس نے اس قسم کے بیس نام بتا کر چند آدمیوں کو عطاروں کے پاس بھیجا، بعض عطاروں نے تو اپنی لاعلمی ظاہر کی لیکن بعض نے قیمت لے کر اپنی دوکان سے کوئی نہ کوئی دوا اٹھا کر دیدی اب افشین نے تمام عطاروں کو طلب کیا، اور جن عطاروں نے لاعلمی ظاہر کی تھی، اُن کو قائم رکھا، اور بقیہ عطاروں کو اپنے لشکر گاہ سے الگ کرکے اس کا عام اعلان کر دیا اور معتصم کو لکھا کہ اس کے پاس وہی عطار اور طبیب بھیجے جائیں، جو متدین ہوں، چنانچہ معتصم نے اس کو پسند کیا، اور اس کے پاس متدین اطبا بھیجے،[1]

یہ تمام اطبا ایک خاص نظام کے ماتحت طبی خدمات انجام دیتے تھے،

۱- ان میں چند مخصوص اطبا خلفا، وامرا کے ملازم تھے، اور تنخواہیں پاتے تھے،

۲- چند اطبا فوج میں ملازم تھے، اور فوج کے ساتھ سفر کرتے تھے،

۳- ان کے علاوہ جو اطبا تھے، وہ پرائیوٹ پریکٹس کرتے تھے، پہلے تو ان پر کوئی قید وبند نہ تھی، بلکہ ہر مرض کا علاج کرتے تھے، لیکن جب سنان بن ثابت نے ان کا امتحان لیا تو ہر طبیب کو صرف اسی مرض

[1] اخبار الحکماء قفطی ص ۱۲۹

کے علاج کرنے کی اجازت دی جس کی وہ قابلیت رکھتا تھا،[1]

منصور کے زمانہ سے لے کر مقتدر کے زمانہ تک یہ اسلامی طب کی مختصر تاریخ ہے، اور مقتدر کے زمانہ تک اگرچہ صرف بغداد میں اطبا کی اس قدر کثرت ہوگئی تھی، کہ مشہور اور شاہی اطبا کے مستثنیٰ کرنے کے بعد جو اطبا سنان بن ثابت کے سامنے امتحان کے لئے پیش ہوئے، اُن کی تعداد آٹھ سو سے زائد تھی، تاہم چونکہ ہم کو ان اطبا کے نام اور حالات معلوم نہیں ہیں، اس لئے ہم نہیں بتا سکتے کہ اس زمانہ میں کس قدر مسلمان اطبا موجود تھے، اس زمانہ کے مشہور اطبا کے جو حالات تذکروں میں مذکور ہیں، وہ سب کے سب عیسائی، صابی اور یہودی ہیں، ان میں کسی مشہور مسلمان طبیب کا نام ہم کو نہیں ملتا، تاہم اس میں شبہ نہیں کہ اس زمانہ میں طب کی تعلیم نصاب درس کا لازمی جزو ہوگئی تھی، اس لئے مسلمانوں میں جو لوگ مشہور فلسفی گذرے ہیں، سب نے علم طب کی تعلیم حاصل کی تھی، مسلمانوں میں پہلا شخص جو فلسفی کے لقب سے مشہور ہوا، وہ یعقوب کندی تھا، اور اس کے تذکرہ میں علامہ ابن ابی اصیبعہ نے طبقات الاطبا میں لکھا ہے، کہ وہ علم طب کا عالم تھا، اور فارابی کی نسبت تصریح کی ہے، کہ وہ علم طب میں بڑی مہارت رکھتا تھا، البتہ اس نے عملاً کبھی طبابت نہیں کی، لیکن عملی طور پر مسلمانوں میں اب تک کوئی مشہور طبیب نہیں پیدا ہوا تھا، طبی حیثیت سے اس زمانہ میں سب سے پہلے زکریا رازی نے شہرت حاصل کی جو باختلاف روایت ۲۳۶ھ، ۲۴۰ھ، ۲۵۰ھ، ۲۵۱ھ میں پیدا ہوا، اور باختلاف روایت ۳۲۰ھ، ۳۲۱ھ ۳۲۲ھ یا ۳۶۴ھ میں وفات پائی، وہ ابتدا میں عود بجاتا تھا، پھر اس کو چھوڑ کر فلسفہ کی تعلیم حاصل کی، اس کے بعد طب کی طرف متوجہ ہوا، اور ابن خلکان کا بیان ہے، کہ اس نے جس وقت طب کی تعلیم شروع کی، اوس کا سن ۴۰ سال سے متجاوز ہو چکا تھا،

طبی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اس نے طبابت کا مستقل پیشہ اختیار کر لیا اور پہلے رے کے شفاخانہ کا

[1] طبقات الاطبا، جلد اول ص ۲۲۲،

پھر خلیفہ مکتفی کے زمانہ مین بغداد کے شفاخانے کا افسر مقرر ہوا[1] اور عمر بھر اسی فن کی تکمیل مین مصروف رہا، یہان تک کہ اس فن کا امام ہو گیا، چنانچہ علامہ ابن خلکان لکھتے ہین کہ وہ علم طب مین اپنے وقت کا امام تھا، اور اس زمانہ مین اس کی طرف انگلیون سے اشارہ کیا جاتا تھا، وہ فن طب مین کامل اور اس کے اصول و فوائد کا ماہر تھا، اور علم طب حاصل کرنے کے لئے لوگ اس کے پاس سفر کر کے آتے تھے، وہ خود بیان کرتا ہے کہ میرے پاس چین کا ایک شخص آیا، اور ایک سال تک مقیم رہا، اس مدت مین اس نے عربی زبان اور عربی خط سیکھا، یہانتک کہ پانچ مہینہ مین نہایت فصیح اور زود نویس ہو گیا، جب اوس نے اپنے وطن کو واپس جانا چاہا، تو ایک مہینہ پیشتر مجھ سے کہا کہ مین چاہتا ہون کہ آپ جالینوس کی سولہ کتابون کا املا کرا دیجئے تاکہ مین اُن کو لکھ لون، مین نے کہا کہ وقت بہت کم ہے اور تم اپنے زمانہ قیام مین اس کا تھوڑا سا حصہ بھی نہین لکھ سکتے، اوس نے کہا آپ جس قدر جلد ممکن ہو املا کرائیے، مین اس سے بھی زیادہ تیزی سے لکھتا جاؤن گا، مین نے اپنے بعض شاگردون کو بھی اپنے ساتھ لیا، اور جس قدر جلد ممکن ہوا، سب مل کر املا کرانے لگے، اور وہ اس سے بھی زیادہ تیزی سے لکھنے لگا، جب ہم نے مقابلہ کیا، تو ہم نے اس کی تصدیق کی، مین نے اس کے متعلق اس سے سوال کیا تو اوس نے کہا کہ ہمارے یہاں ایک خط ہے جس کو مجموع کہتے ہین، اور یہ وہی خط ہے جس کو آپ دیکھ رہے ہین، جب ہم کسی طویل تحریر کو تھوڑی سی مدت مین لکھنا چاہتے ہین تو پہلے اوس خط مین لکھتے ہین، پھر اگر ضرورت ہوتی ہے تو اوس کو معمولی خط مین نقل کر لیتے ہین[2]،

علامہ ابن خلدون لکھتے ہین کہ اس فن مین اسلام مین بھی ایسے ائمہ پیدا ہوئے جو ذروۂ کمال سے بھی آگے نکل گئے، مثلاً رازی، مجوسی اور ابن سینا[3]،

علامہ ابن ابی اصیبعہ طبقات الاطبار مین لکھتے ہین کہ وہ فن طب کے مشکل مسائل پر ہمیشہ غور و فکر کرتا رہتا تھا، اور اس کے حقایق و اسرار کھولا کرتا تھا، اور اس مین اس قدر مشغول رہتا تھا کہ ہمہ وقت

---

[1] ابن خلکان جلد ۲ ص ۸۰، [2] فہرست ابن ندیم ص ۲۵ [3] مقدمہ ابن خلدون ص ۱۱م،

اجتہاد کیا کرتا تھا، اور علمار نے اپنی کتابون مین جو کچھ لکھا ہے، اس سے واقفیت حاصل کرتا رہتا تھا، اوس نے خود اپنی بعض کتابوں مین لکھا ہے کہ میرا ایک شریف دوست تھا، جو راتون کو مجھ سے بقراط اور جالینوس کی کتابون کے متعلق گفتگو کیا کرتا تھا، رازی کو فن طب مین جو مہارت حاصل ہوئی، مریضون کے علاج مین اوس نے جو انفرادی شان پیدا کی، اُن کے حالات پر اوس نے طبی پیشنگوئیون سے جو استدلال کیا، دواؤن کے اوصاف و خواص کا جہان تک اور اطبار کا علم نہ پہنچ سکا تھا، اوس نے جو تجربہ کیا، اُن سب کے متعلق بہت سے تاریخی واقعات ہین، جو اس کی بہت سی کتابون مین درج ہین، اور ان سب کو اس نے اپنی کتاب حاوی کے ایک علحدہ باب مین اور اپنی کتاب سر الطب میں بیان کر دیا ہے،

اس کے بعد رازی کی طبی مہارت کے متعلق اونھون نے دو حکایتین نقل کی ہین، اور ان حکایتون کے نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ رازی کے متعلق اس قسم کی اور بھی بہت سی حکایتین ہین، اور ان کا بہت بڑا حصہ مین نے کتاب حکایات الاطبار مین بیان کر دیا ہے، رازی کی طبی مہارت کا خلاصہ صرف ایک فقرے مین بیان کیا جا سکتا ہے، جو بطور ضرب المثل کے مشہور ہو گیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ فن طب مردہ ہو گیا تھا، جالینوس نے اس کو زندہ کیا، وہ پراگندہ تھا، رازی نے اس کو ایک شیرازہ مین منسلک کیا، وہ ناقص تھا، ابن سینا نے اس کی تکمیل کی، طب کے ان پراگندہ مسائل کا سب سے بڑا مجموعہ اس کی کتاب حاوی ہے، جس مین اوس نے امراض اور ان کے طریقہ علاج کے متعلق قدمار کی اور ان کے بعد اپنے زمانہ تک کے اطبار کی کتابون مین جو کچھ تھا، سب کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے، اور ہر قول کو اوس کے قائل کی طرف منسوب کیا ہے،

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مسلمانون مین طب کا سلسلہ اطبائے اسکندریہ کے ذریعہ سے پھیلا جن کو اسکندرانی کہتے ہین، یہ سات طبیب تھے، جنھون نے اسکندریہ مین ایک طبی درسگاہ قائم کی تھی

اور صرف جالینوس کی سولہ کتابین ان کے نصاب تعلیم مین داخل تھین، جن کو آسانی سے یاد کرنے اور
سمجھنے کے لئے انھون نے اُن کے خلاصے کرلئے تھے، اس کے بعد انھون نے ان کتابون کی شرح کی تھی؛
یحیی نحوی انہی اطبا مین شامل تھا، جو اسلام کے ابتدائی زمانہ تک زندہ رہا، لیکن ان اطبار کے علاوہ اور
بھی بہت سے طبیب تھے، جو اطباے اسکندریہ کے معاصر یا ان کے زمانہ سے قریب تھے، اور ان کی کتابین اسلام کے
زمانہ تک موجود تھین، رازی کا سب سے بڑا طبی کارنامہ جو یہ خیال کیا جاتا ہے، کہ اوس نے طب کے پراگندہ مسائل
کو ایک جگہ جمع کر دیا، اس کا مطلب یہ ہے کہ اوس نے صرف جالینوس کی ۱۶ کتابون اور اطباے اسکندریہ
کی شرحون پر قناعت نہیں کی، بلکہ اُن کے علاوہ اُن کے معاصر اطبار کی کتابون کا بھی مطالعہ کیا، اور
اُن کے مطالب اپنی کتاب حاوی مین نقل کئے۔[1]

موجودہ دور مین اہلِ مغرب نے بھی فنِ طب میں اس کی بلند پایگی کو تسلیم کیا، یہانتک کہ ۱۹۱۳ء
مین بمقام لندن بین الاقوامی کانگریس مین رازی کے سوانح اور کارنامون کے متعلق ایک خاص کانفرنس
قائم ہوئی، اور اس کا ذکر شاندار مدحیہ الفاظ مین کیا گیا،

۱۹۳۲ء مین پیرس مین رازی کی ہزار سالہ برسی منائی گئی، جس مین ایک مضمون پڑھا گیا، جس کا عنوان
تھا، "عربی طب وتاریخ مین اور فرانس کی طب پر اس کا اثر" اور اس مضمون مین رازی کو بہت بڑا طبیب تسلیم
کیا گیا، اس کے علاوہ اس کی بہت سی طبی کتابون کا ترجمہ یورپین زبانون مین کیا گیا، اور وہ وہان کے نصاب
تعلیم مین داخل رہین، اسی زمانہ کا ایک اور مسلمان طبیب احمد بن ابی الاشعث ہے جو ابتدا مین طبی حیثیت سے
مشہور نہ تھا، بلکہ ایک سرکاری عہدہ دار تھا، لیکن کسی جرم مین ماخوذ ہوا، اور اپنے وطن سے بھاگ کر
موصل مین آیا، یہان ناصر الدولہ کا ایک لڑکا بیمار تھا، جس کو اطبار کے علاج سے شفا نہیں ہوتی تھی؛
بلکہ مرض اور ترقی کرتا جاتا تھا، احمد نے ناصر الدولہ تک رسائی حاصل کی، اور لڑکے کی مان سے کہا کہ

[1] طبقات الاطبار جلد اول ص ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۹،

مین اس کا علاج کرون گا، اسی کے ساتھ ان غلطیوں کو بھی ظاہر کیا، جو اطبار نے طریقِ علاج مین کی تھین،
چنانچہ لڑکے کی مان کا اس کی طرف میلان ہوا اور اس کے علاج سے اس کو شفا ہو گئی، اب وہ نوازش شاہانہ
سے سرفراز ہوا، اور آخر عمر تک موصل مین مقیم رہ کر ۳۶۰ھ مین وفات پائی، وہ اگرچہ طبی حیثیت سے بہت زیادہ
مشہور نہین ہے، تاہم اس کا خاص کارنامہ یہ ہے کہ اس نے جالینوس کی تمام کتابون کی شرح لکھی، اور
جالینوس کی سولہ کتابون کو ابواب وفصول مین تقسیم کیا، اس سے پہلے کسی نے اس قسم کی تقسیم نہین کی تھی، اس لئے
جو لوگ جالینوس کی کتابون کا مطالعہ کرتے تھے، ان کو اس سے بڑا نفع حاصل ہوا، اور ان کو معلوم ہو گیا
کہ اس کی کتابون کے مختلف حصے کن اغراض ومقاصد پر مشتمل ہین۔[1]

محمد بن زکریا رازی کے بعد شیخ بوعلی سینا ۳۷۰ھ مین پیدا ہوا، اور ۴۲۸ھ مین وفات پائی، اُس
طب وفلسفہ دونون مین یکسان شہرت حاصل کی، اگرچہ شیخ کے بیان سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اوس
نے علم طب کو بذاتِ خود حاصل کیا تھا، لیکن علامہ ابن ابی اصیبعہ نے لکھا ہے کہ اس نے ایک عیسائی
طبیب ابوسہل عیسیٰ بن یحیی مسیحی جرجانی سے طب کی تعلیم حاصل کی تھی،[2] ابوسہل کے علاوہ، وہ اس زمانہ
کے ایک اور مشہور طبیب ابومنصور الحسن بن نوح القمری کے حلقۂ درس مین بھی شامل ہوا، اور اس سے
طبی تعلیم حاصل کی،[3]

تاہم اس مین شبہ نہیں کہ شیخ کی طبی مہارت اور طبی شہرت زیادہ تر کثرتِ مطالعہ کا نتیجہ ہے، چنانچہ
ایک بار نوح بن منصور سامانی جو بخارا کا بادشاہ تھا، ایک ایسے مرض مین مبتلا ہوا، کہ تمام اطبار اوس کے
علاج مین ناکامیاب رہے، لیکن کثرتِ مطالعہ کی وجہ سے اطبار مین شیخ کو بھی شہرت حاصل ہو چکی تھی،
اس لئے انھون نے نوح کے سامنے شیخ کا تذکرہ کیا، اور اس کے بلانے کی درخواست کی تو شیخ آکر
ان اطبار کے ساتھ اس کے معالجہ مین شریک ہوا، اور اس کو شفا حاصل ہو گئی، اور اس تقریب سے

[1] طبقات الاطبار جلد اول ص ۲۴۶ [2] ر صفحہ ۳۲۸ [3] ر ص ۳۲۷،

اس کے توسلین مین داخل ہوگیا، اور اسی سلسلے میں اس نے نوح کے کتب خانے مین داخل ہونے اور طبی کتابوں کے پڑھنے اور مطالعہ کرنے کی اجازت چاہی، اتفاق سے کتب خانے مین آگ لگ گئی، اور تمام کتابین جل گئین، اب اس کتب خانہ کے علوم کا عالم صرف شیخ رہ گیا، اس بناپر شیخ کے مخالفین کا خیال ہو کہ خود شیخ ہی نے اس کتب خانہ مین آگ لگادی تاکہ ان علوم کو اپنی طرف منسوب کرلے اور یہ ظاہر کرے کہ وہ ان علوم کا سب سے بڑا عالم ہے، بہرحال واقعہ جو کچھ بھی ہو، لیکن زکریا رازی کے بعد شیخ نے طب مین اس سے بھی زیادہ شہرت حاصل کی، لیکن تاریخی حیثیت سے یہ واقعہ نہایت حیرت انگیز ہے، زکریا رازی کی طرح شیخ بھی کثیر التصنیفات ہے، لیکن اس کی کتابون کی جو فہرست تذکرون مین منقول ہے، اس مین زیادہ تر فلسفہ وحکمت کی کتابین ہین، طبی کتابین بہت کم ہین، اس کے برخلاف رازی کی کتابون کا حصہ زیادہ تر طبی تصنیفات پر مشتمل ہے، اور طب کے ہر موضوع پر اس نے رسالے اور کتابین لکھی ہین، اس کے ساتھ شیخ کو فلسفہ، طب اور دوسرے علوم کی تدوین اور ترتیب مین جو شہرت اور اہمیت حاصل ہے، اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اس نے ان علوم مین بہت سے ایجادات واختراعات کئے ہین، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے ان علوم کی تمام شاخون کو باقاعدہ منظم اور مرتب کردیا، اور مبتدی، منتہی، اور متوسط ہر طبقہ کے لئے کتابین لکھدین، اس لئے اس کی کتابین نصاب تعلیم کا بہترین جزو ہوگئین، اور درس وتدریس کی وجہ سے اُن کی عام اشاعت ہوگئی، اور شیخ کی قانون مدتون یورپ کے بڑی بڑی طبی مدرسوں مین زیر درس رہی

شیخ کے ذاتی بیانات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اصلی سرمایۂ افتخار فلسفہ تھا، فن طب نہ تھا، وہ ایک معجب، خودپسند اور مغرور شخص تھا، اور بڑے بڑے اطبار وحکماء پر ذاتی حملے کیا کرتا تھا، لیکن اس کا یہ حملہ صرف ان کی فلسفہ دانی پر ہوتا تھا، ان کی طبی مہارت کا وہ بھی قائل تھا، زکریا رازی کی نسبت وہ کہا کرتا تھا کہ وہ ایک مصنوعی اور طفیلی شخص ہے اس کا کام صرف بول وبراز کا

دیکھنا ہے، اس فقرے مین اوس نے اس کی طبی مہارت کا تو دبی زبان سے اعتراف کیا ہے، البتہ اس کی فلسفیانہ مہارت کا منکر ہے، اس لئے شہرزوری نے تاریخ الحکما مین اس قول کو نقل کرکے لکھا ہو کہ ابن سینا نے بالکل سچ کہا کیونکہ معالجات طبیہ مین تو وہ ذروۂ کمال تک پہنچ گیا تھا، لیکن طب کے علاوہ اور علوم مین اوس نے صرف لغو باتین کہین،

شیخ کا ایک ممتاز معاصر ابوالفرج بن الطیب ایک عیسائی طبیب تھا، جو شفاخانہ عضدیہ میں طب کی تعلیم دیتا تھا، فن طب کے ساتھ فلسفہ مین بھی مہارت رکھتا تھا، اور ارسطو کی بہت سی فلسفیانہ کتابون کی شرح لکھی تھی، شیخ اس کی طبی تصنیفات کا تو مداح تھا، لیکن فلسفیانہ حیثیت سے اس کا قائل نہ تھا، ایک رسالہ خاص اس کی تردید مین لکھا تھا، اور اس مین اس کی نسبت یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ شیخ ابوالفرج بن الطیب کی طبی تصنیفات ہم کو ملین، اور ہم نے ان کو صحیح وپسندیدہ پایا، لیکن منطق وطبیعیات وغیرہ پر اس کی تصنیفات کی حالت بالکل برعکس نکلی،[۵۱] لیکن بہرحال شیخ کے زمانہ سے مسلمانون مین فن طب کی عام اشاعت ہوئی اور چھٹی اور ساتوین صدی ہجری تک بکثرت مسلمان اطبا پیدا ہوگئے جن کے حالات علامہ ابن ابی اصیبعہ نے طبقات الاطبا مین تفصیل کے ساتھ لکھے ہین، لیکن ان مین دو شخص خاص طور پر اس لئے قابل ذکر ہین کہ انھون نے مفرد دواؤن کی تحقیقات مین موجودہ زمانہ کے طریقہ پر اپنی عمرین صرف کردین،

یونان مین جو اطبا پیدا ہوئے، ان مین ایک خاص طبیب دیسقوریدس تھا جس نے بہت سے شہرون کا سفر کرکے جنگلون، جزیرون اور سمندرون کی تمام جڑی بوٹیون، اور مفرد دواؤن کا سُراغ لگایا تھا، ان کی تصویرین لی تھین، اور ان کے افعال وخواص پر ایک کتاب لکھی تھی، جس کا نام کتاب الحشایش تھا،[۵۲] جعفر متوکل کے عہد خلافت مین اصطفن بن بسیل نے یونانی زبان سے اس کا ایک

---

[۵۱] طبقات الاطبا جلد اول ص ۲۳۹ [۵۲] فہرست ابن ندیم ص ۲۰۸،

ناقص ترجمہ عربی زبان مین کیا، اور ایک مدت تک اطبا، مفرد دواؤن کی تحقیقات مین اسی کتاب سے فائدہ اٹھاتے رہے، اس کے علاوہ یحییٰ بن خالد برمکی نے اپنے دورِ وزارت مین ایک شخص کو ہندوستان مین اس غرض سے روانہ کیا تھا کہ وہ ہندوستان کی جڑی بوٹیون کو خود ہندوستان سے لائے[1] تاہم ۔۔۔ کے زمانے تک کسی مسلمان طبیب نے ادویہ مفردہ کی تحقیقات کی طرف خاص توجہ نہین کی تھی، لیکن ۔۔۔ کے بعد رشید الدین صوری نے فنِ طب کی اس خاص شاخ مین نہایت امتیاز حاصل کیا، اور عمر بھر ادویہ مفردہ کی تحقیقات کرتا رہا، وہ ۵۷۳ھ مین پیدا ہوا، اور ۶۳۹ھ مین وفات پائی، اس کی تحقیقات کا طریقہ یہ تھا کہ جن مقامات پر جڑی بوٹیان زیادہ پیدا ہوتی تھین، وہان خود جاکر اُن کو اپنی آنکھون سے دیکھتا تھا، ساتھ مین ایک مصور ہوتا تھا، جس کے پاس مختلف قسم کے رنگ ہوتے تھے، وہ ان جڑی بوٹیون کو دیکھ کر مصور کو دکھاتا تھا، اور وہ اُن کے رنگ، پتی کی مقدار، شاخ، اور جڑ کو اچھی طرح دیکھ کر ان ہی کے مطابق ان کی تصویر کھینچتا تھا، صرف اسی پر قناعت نہین کرتا تھا، بلکہ مصور کو ان جڑی بوٹیون کو پہلے اُن کی ابتدائی نشو ونما کے زمانہ مین دکھاتا تھا، اور وہ ان کی تصویر کھینچ لیتا تھا، پھر جب اُن کی نشو ونما مکمل ہو جاتی تھی، اور ان مین تخم پیدا ہو جاتے تھے، تو مصور اس حالت کی الگ تصویر کھینچتا تھا، پھر جب وہ خشک ہو جاتی تھیں تو اس حالت کی تصویر الگ لی جاتی تھی، اس طرح ایک ہی جڑی بوٹی کی تحقیقات جن مختلف صورتون مین ممکن تھی، ہو جاتی تھی،

اُس نے ان تحقیقات کے نتائج کو ایک مستقل کتاب مین درج کیا تھا، جس کو ملک المعظم عیسیٰ بن ابوبکر کے زمانہ مین اس کے نام پر لکھا تھا، اور اس مین نہایت استقصا، کے ساتھ تمام مفرد دواؤن کے نام اور خواص لکھے تھے، اور بہت سی ایسی دواؤن کے نام کا بھی اضافہ کیا تھا، جن کا ذکر قدما کی کتابون مین موجود نہ تھا، ایک اور کتاب بھی لکھی تھی، جس مین ادویہ مفردہ کے متعلق تاج بلغاری کی کتاب کا رد کیا تھا،[2] (باقی)

---

[1] فہرست ابن ندیم ص ۴۴۴ [2] طبقات الاطباء جلد دوم از ص ۲۱۶ تا ۲۱۹،

اشرف علی فغان

از

جناب سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب ایم اے

"سودا کے معاصر شعرا، مین اشرف علی فغان مشہور اور بلند پایہ شاعر تھے، ان کے حالات اور کلام کا انتخاب تو نئے پرانے تمام تذکرون میں ملتا ہے لیکن ان کا دیوان اب تک شائع نہیں ہوا تھا، اس کے قلمی نسخے بھی کمیاب تھے، ہمارے رفیق سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب ایم اے نے بڑی تلاش و جستجو سے اس کے تین نسخے فراہم کرکے ان کی مدد سے ایک صحیح نسخہ مرتب کیا تھا، اور فغان کے حالات اور اُن کے کلام پر ایک مبسوط تبصرہ لکھا تھا، یہ دیوان انجمن ترقی اردو نے طبع کرایا تھا لیکن شائع ہونے کی نوبت نہین آئی تھی کہ دلی کے گذشتہ فساد مین انجمن ترقی اردو کے بیش قیمت کتب خانہ اور اس کے ذخیرہ کتب کے ساتھ یہ دیوان بھی تلف ہوگیا، اور اب دوبارہ شاید ہی اس کی تصحیح کی نوبت آسکے، لائق مرتب نے مقدمہ مین حالات اور کلام پر تبصرہ کے ساتھ قلمی نسخون کے متعلق بھی ضروری اور مفید معلومات لکھے تھے، یہ حصہ تو اصل کے ساتھ ضائع ہوگیا، لیکن فغان کے سوانح اور کلام پر تبصرہ کی ایک نقل اتفاق سے ان کے پاس رہ گئی تھی، اس کو بطور یادگار ناظرین معارف کی خدمت مین پیش کیا جاتا ہے، "م"

نام و نسب مرزا اشرف علی خان نام اور فغان تخلص تھا، شاہ جہان آباد مین پیدا ہوئے، سنہ ولادت معلوم نہ ہو سکا، مگر احمد شاہ کے رضاعی بھائی تھے، اس لئے اس کے سنہ ولادت سے ان کی پیدائش کی تاریخ بھی

متعین کی جا سکتی ہے، احمد شاہ کا سنہ پیدائش ۱۱۴۰ھ ہے، رضاعی بھائی ہونے کی حیثیت سے اشرف علی خان ایک یا زیادہ سے زیادہ دو سال بڑے ہوں گے، اس لئے ۱۱۳۹ھ سے ۱۱۴۱ھ تک کسی سال میں ان کی پیدائش ہوئی ہو گی،

والد کا نام مرزا علی خان نکتہ تھا،[1] نکتہ شاید تخلص ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اشرف علی خان کے پدر بزرگوار بھی شاعر تھے، اُن کا خاندان دنیاوی وجاہت کے لحاظ سے ممتاز تھا، اور تیموری دربار سے گہرا تعلق رکھتا تھا، ماں نے احمد شاہ کو دودھ پلایا، اس لئے خود کوکہ، کوکہ خان،[2] کوکلتاش،[3] یا کوکلتاش خان بہادر کہلائے،[4] چچا ایرج خان مرشد آباد میں شاہی ملازم[5] تھے، بعد وہاں کے حاکم تھے،[6]

تعلیم: فغان کے تعلیمی حالات کا ذکر کسی تذکرہ میں نہیں، محمد حسین آزاد نے صرف اتنا لکھا ہے کہ ابتدائے عمر میں شعر گوئی کا شوق ہوا، طبیعت ایسی مناسب واقع ہوئی تھی، کہ جب ہی سے اس کام میں نام پیدا کیا[7]، شاعری میں یہ شاید کئی استادوں سے مستفید ہوئے، ان کے دوست اور معاصر میر تقی میر نے لکھا ہے کہ وہ قزلباش خان امید کے شاگرد تھے،[8] مصحفی[9]، اور لطف[10] نے ان کو ندیم کا شاگرد بتایا ہے، نساخ نے بھی ان کو علی قلی خان ندیم ہی کا شاگرد بتایا ہے، اور لکھا ہے کہ "بعضے صاحب تذکرہ نے جو ان کو قزلباش خان امید کا شاگرد لکھا ہے، غلطی کی ہے"[11]

---

[1] گلشن ہند میرزا علی لطف مرتبہ مولانا شبلی و مولوی عبدالحق ص ۱۳۰، [2] مخزن نکات مصنفہ شیخ محمد قیام الدین قائم ص ۴۴، انجمن ترقی اردو، [3] مجموعۂ نغز مصنفہ میر قدرت اللہ قاسم مرتبہ پروفیسر محمود شیرانی جلد دوم ص ۳، [4] گلشن بے خار از مصطفیٰ خان شیفتہ ص ۲۴۰، [5] گلشن ہند ص ۱۳۰، [6] آب حیات [7] آب حیات از محمد حسین آزاد ص ۱۱۳، [8] نکات الشعراء مؤلفہ میر تقی میر، مرتبہ مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی ص ۰، [9] تذکرہ ہندی مؤلفہ غلام ہمدانی مصحفی مرتبہ مولوی عبدالحق صاحب ص ۱۶۰، [10] گلشن ہند ص ۱۳۰، [11] سخن شعراء مؤلفہ عبدالغفور خان نساخ نولکشور پریس ص ۳۶۵،

فغان نے ندیم سے اپنے رشتۂ شاگردی کا اظہار جا بجا کیا ہے،

کیا فغان سے پوچھتے ہو کون تھا حضرت ندیم — پیر تھا، مرشد تھا، ہادی تھا، میرا استاد تھا

ہر چند اب ندیم کا شاگرد ہے فغان — وہ دن کے بعد دیکھیو استاد ہو گیا

دشتِ جنون میں کیوں نہ پھرون میں برہنہ پا — اب تو فغان ندیم مرا رہنما ہوا

کہتا کوئی فغان کی طرف سے ندیم کو — اب دل تو جا چکا بھلا استاد کیا کرون[1]

مگر ایک قطعہ میں فغان نے امید کا بھی نام لیا ہے،

شاہدِ حال ہے یہ مصرعِ امید فغان — کا ہمیکو بدلتے ہیں، مردم آگاہ غلط

اولِ عشق میں ناحق مجھے اخراج کیا — بعد آیا تو عبث فائدہ ما بعد غلط

اب مجھے دبوے اذیت تو سزا ہے میری — کردہ این مرتبہ ہم بندۂ درگاہ غلط

اس قطعہ سے امید اور فغان کے ذہنی تعلقات کی غمازی ہوتی ہے، مولانا عبدالحی نے گلِ رعنا میں لکھا ہے کہ "ممکن ہے کہ پہلے امید سے اصلاح لیتے ہوں، پھر ندیم کے شاگرد ہوئے ہوں، یا فارسی میں اُن کے شاگرد ہوں"[2] ممکن نہیں بلکہ یہ واقعہ ہے کہ فغان نے فارسی میں امید سے اصلاح لی، یہی زمان شفیق کے تذکرۂ چمنستان شعراء میں ہے،

---

[1] ندیم، نام مراد علی قلی خان تھا، وطن شاہجہان آباد تھا، دہلی کی تباہی کے بعد مرشد آباد آئے، اور نواب میر جعفر خان کی ملازمت میں داخل ہوئے، اسی کے عہد میں ان کا انتقال ہوا، پہلے مرثیہ و سلام کہا کرتے تھے، لیکن پھر ریختہ کہنے لگے، میر حسن نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ

"مردے بود بکمال قابلیت شعر فارسی و مرثیہ و ریختہ بخوبی می گفت۔

ان کے مختصر حالات تذکرۂ ہندی مجموعۂ نغز، گلزار ابراہیم اور تذکرۂ میر حسن میں ملیں گے،

[2] گلِ رعنا، ص

"در شعر فارسی اصلاح سخن از قزلباش خان امید می گرفت"[۱]

فغان نے اپنے قطعات میں بیتاب اور حشمت کے بھی نام لئے ہیں،

سُن کے اس مطلع بیتاب کو کہتا ہے فغان — کھینچیئے تیغ میری جان کہ تیار ہون مین

---

[۱] چمنستان شعرا صفحہ ۳۰۰۔ قزلباش خان امید، اصلی نام مرزا محمد رضا تھا، ہمدان کے رہنے والے تھے، جوانی میں ترک وطن کر کے اصفہان آئے، اور میرزا طاہر وحید کے شاگرد ہوئے، اورنگ زیب کے زمانہ میں ہندوستان آئے، اور شاہی ملازمت میں داخل ہو کر بہادر شاہ کے وقت میں قزلباش خان خطاب اور ہزاری منصب پایا، چنانچہ خود کہتے ہیں،

مثل بلبل ہمیشہ نالانم — این بود منصب ہزاری ما

معز الدین کے وقت میں کسی خدمت کی تقریب سے برہان پور گئے، اور جب امیر الامرا سید حسین دکن کا صوبہ دار مقرر ہوا، تو یہ اس کے دامنِ دولت سے وابستہ ہو کر، کرناٹک کے داروغہ ہوئے، یہاں بھی زمانہ نے ساتھ نہ دیا، تو حید آباد کے ناظم مبارز خان کی سرکار میں آکر ملازمت کی، جب نظام الملک آصفجاہ نے مبارز خان پر فتح پائی، تو یہ بھی قید ہوئے، مگر انھوں نے آصف جاہ کی خدمت میں ایک غزل پیش کی، جو آصف جاہ کو ایسی پسند آئی، کہ امید کو نہ صرف قید سے آزاد کیا، بلکہ کرناٹک کے علاقہ میں مرکب کی قلعہ داری مرحمت کی کچھ دنون کے بعد امید حج کرنے کو گئے، وہان سے واپس ہوئے تو آصف جاہ کے مقرب خاص بن گئے ۱۱۵۰ھ میں دلی آئے، آصف جاہ جب مرہٹوں کی بغاوت فرو کرنے کے لئے بھوپال گئے، تو امید بھی ہمرکاب تھے، نادر شاہ کے حملے کے زمانہ میں آصف جاہ کو دلی بلایا گیا، تو وہ بھی ساتھ آئے، پھر دلی کی محبت سے ایسے مغلوب ہوئے کہ بقیہ عمر یہیں گذاری اور ۱۱۵۹ھ میں انتقال کیا، آٹھ ہزار فارسی اشعار کا ایک دیوان چھوڑا، کبھی کبھی ریختہ بھی کہتے تھے، فن موسیقی کے بھی ماہر تھے، (مآثر الکرام دفتر ثانی مصنفہ میر غلام علی آزاد بلگرامی ص ۲۱۰، گلزار ابراہیم انجمن ترقی اردو ص ۱۸، ۱۹، ۲۰)

قتل کر دیجیئے مجکو تو سزاوار ہون مین — ہان میاں تشنۂ آب دم تلوار ہون مین[۱]

غل اٹھا مصرعہ حشمت کا فغان زندان مین — پھیر زنجیر کی جھنکار پڑی کان کے بیچ[۲]

معلوم نہیں فغان نے ان دونون کے نام محض تحسین کے جذبہ میں یا کسی فیض کے امتنان و تشکر میں لئے ہیں،

---

[۱] بیتاب، نام محمد اسمٰعیل، مصطفےٰ خان یکرنگ کے شاگرد تھے، گردیزی نے لکھا ہے، کہ "نکتہ سنج معنی یاب محمد اسمٰعیل بیتاب پایۂ سخنش بلند حرفش دل پسند است" بھی نرائن شفیق لکھتے ہیں، کہ سحاب گوہر پاش سخن دریائے مواج این فن است، خود را از تلامذہ مصطفےٰ خان یکرنگ می پندارد، و تلاش ہائے فراوان بالفاظ تازہ و مضامین نو می وارد" ص ۵۰ گھوڑے سے گر کر ایسے زخمی ہوئے کہ پھر جانبر نہ ہو سکے،

[۲] حشمت کا پورا شعر یہ ہے

نکہتِ گل نے جگایا کسے زندان کے بیچ — پھیر زنجیر کی جھنکار پڑی کان کے بیچ

حشمت تخلص اور نام محتشم علی خان تھا، باپ کا نام میر باقی اور بڑے بھائی کا میر ولایت اللہ خان تھا، ان کا خاندان بدخشان سے ہندوستان آیا، نسباً سید تھے، لیکن پیشہ سپہگری کا تھا، دلی میں مغل پور میں رہتے تھے، اپنے زمانہ کے ممتاز شاعر تھے، محمد شاہ کے عہد میں انتقال ہوا، گردیزی میں ہے، "سخنش دلپسند است و فکرش بلند، بکمال خوش خلقی، و فراخ حوصلگی زیست می کرد،...... دیوانش فقیر سیر کردہ و چشمے آب دادہ حقا کہ در آن تلاش معنی تازہ کردہ، و الفاظ رنگین بروے کار آوردہ، احیاناً ریختہ می گفت" میر تقی میر ان کے بارے میں لکھتے ہیں، کہ شاعر خوب فارسی و ریختہ فہمید سنجیدۂ باہمہ عجز و انکسار پیش می آید، جنسے بود کہ در دل ہمہ کس جائے خالیست...... بر فقیر شفقت و عنایت بسیار می کند...... گلشن ہند میں ہے، "از مشاہیر شعرائے دہلی است، شعر فارسی را نیکو می گفت، و ترکیب بندے ریختہ از وے بسیار شہرت دارد، باعتبار اطوار و آشفتگی دل نشین مردم افتادہ است..... ارتحالش در زمان محمد شاہ فردوس آرام گاہ است"

فغان کے حالاتِ زندگی

فغان بچپن سے جوانی کے عالم تک احمد شاہ کے ساتھ رہے، احمد شاہ کی تخت نشینی کے بعد اس کے ندیم خاص ہوئے، احمد شاہ اُن کی لطیفہ گوئی، بذلہ سنجی اور حاضر جوابی کا بے حد مداح تھا، اس لئے ظریف الملک کوکہ خان بہادر کا خطاب عطا کیا[۱]، اشرف علی خان کی حیثیت محض لطیفہ گو کی نہ تھی، بلکہ وہ ایک معزز درباری امیر تھے، شیخ محمد قیام الدین قائم مخزنِ نکات (نوشتہ ۱۱۶۸ھ) میں لکھتے ہیں:-

"در زمان سلطنت مرزا احمد بمنصب پنجہزاری مفتخر و مباہی گشت"[۲]

تذکرہ ریختہ گویان مؤلفہ سید فتح علی حسینی گردیزی (نوشتہ ۱۱۶۶ھ) میں ہے،

"اشرف علی فغان تخلص از عمدۂ منصب داران عہد سعادت میداشت"[۳]

اس کی تصدیق میر تقی میر کے بیان سے بھی ہوتی ہے،

"فغان تخلص کوکۂ بادشاہ احمد شاہ، داخل ذیل نیمچۂ امرایان است"[۴]

بچھمی نرائن شفیق نے چمنستانِ شعراء (نوشتہ ۱۱۷۵ھ) میں لکھا ہے:-

"از امرایان درگاہ احمد شاہ بادشاہ بود"[۵]

میر قدرت اللہ قاسم نے بھی انھیں "بسیار عمدہ معاش"[۶] اور شیفتہ نے "از اہل ثروت بودہ" لکھا ہے[۷]

مگر اشرف علی فغان کو امارت و ثروت کی بہار زیادہ دنوں تک دیکھنا نصیب نہ ہوا، ان کی زندگی کا زمانہ وہ تھا، جب شاہجہان آباد پر مصیبت والم کی گھٹائیں برس رہی تھیں، محمد شاہ کے

[۱] گلشن ہند ص ۱۳۰، [۲] مخزنِ نکات ص ۴۲، [۳] تذکرہ ریختہ گویان مؤلفہ سید فتح علی حسینی گردیزی مرتبہ مولوی عبدالحق صاحب انجمن ترقی اردو، ص ۱۲۱ [۴] نکات الشعراء مؤلفہ میر تقی میر، مرتبہ مولانا حبیب الرحمن خان شیروانی ص ۱۰۷ [۵] چمنستان شعراء، انجمن ترقی اردو، ص ۲۸۲ [۶] مجموعہ نغز ص ۲ [۷] گلشن بے خار ص ۲۰۲، مطبوعہ اردو اخبار پریس، دہلی،

عہد کی طوائف الملوکی اور خانہ جنگی مرہٹوں کی سرکشی اور شورہ پشتی اور نادر شاہ کی غارت گری اور خونریزی سے تیموری حکومت کی بنیادیں کھوکھلی پڑ گئی تھیں، اکبر اور عالمگیر کی پُر جلال اور پُر شوکت سلطنت کا زوال اپنے عروج پر تھا، محمد شاہ کے بعد احمد شاہ تخت پر ضرور بیٹھا، لیکن وہ محض اپنے اجداد کی سلطنت کی پامالی اور زبوں حالی کے مناظر دیکھنے کو بیٹھا تھا، سلطنت میں ایک لوٹ مچی ہوئی تھی، نادر شاہ کے بعد احمد شاہ دُرانی کی نظریں ہندوستان جنت نشان پر لگی ہوئی تھیں، وہ تیموری سلطنت کے چراغِ سحری کو اپنی طوفانی فوجوں کے تند جھونکوں سے بجھا دینا چاہتا تھا، مگر قدرت نے یہ انجام اس کے ہاتھوں سے نہ لکھا تھا، وہ آیا اور چلا گیا، تیموریوں میں درانیوں کے حملوں کو روکنے کی تاب نہ تھی، اس لئے ملتان اور لاہور کے دو صوبے دے کر احمد شاہ نے تھوڑے دنوں کے لئے اپنے کو بچا لیا، لیکن تنہا درانیوں کے حملے ہی کی مصیبت نہ تھی، دُرانی جانے بھی نہ پائے تھی کہ روہیلوں اور مرہٹوں کی معاندانہ کارروائیوں سے سلطنت کا شیرازہ اور بکھر گیا، خود دربار میں امرائے واعیان سلطنت میں اتفاق نہ تھا، ان کی ریشہ دوانیوں سے رہی سہی قوت بالکل جاتی رہی، بادشاہ بے جان اور عمائدِ حکومت کے ہاتھوں مجبور تھا، آخر کار ۱۱۶۷ھ میں احمد شاہ تخت سے اتار کر قید خانہ میں بٹھا دیا گیا، اور دوسرا بے بس اور لاچار بادشاہ عالمگیر ثانی کے لقب سے زینت تخت و تاج بنایا گیا،

ان ہنگاموں میں احمد شاہ کے درباری، امیر، ندیم خاص اور رضاعی بھائی اشرف علی خان فغان کو بھلا کہاں چین نصیب ہو سکتا تھا، دربار قتل و خون کا مرکز اور شاہجہاں آباد کی گلیاں ماتم کدہ بنی ہوئی تھیں، دولت اور عزت دونوں کی غارت گری ہو رہی تھی، فغان دلی کی بربادی نہ دیکھ سکے اور وہاں سے چل کھڑے ہوئے،

یہ کہنا مشکل ہے کہ احمد شاہ کی معزولی کے فوراً ہی بعد یا کچھ دنوں رہ کر فغان نے دلی چھوڑی، لیکن قیاس کہتا ہے کہ احمد شاہ کی معزولی اور قید کے بعد دہلی چھوڑ دی، فغان کے معاصر مصحفی اپنے

تذکرہ مین لکھتے ہین کہ

"در ایامیکہ بسبب تفرقۂ شاہ از شاہجہان آباد برآمدہ بطرف پورب گذر انگندہ"[51]

"تفرقۂ شاہ" سے احمد شاہ کی قید ہی مراد ہوگی، لیکن مجموعہ نغز (نوشتہ ۱۲۲۱ھ) مین ہے:

"بنا بر افراط و تفریطے کہ در ہنگامہ آرائی افاغنہ ابدالی بحضرت دہلی رو دادہ بدیار شرقیہ شتافتہ، رحل اقامت انداخت"[52]

شاید اسی استناد پر محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ جب احمد شاہ دُرانی کے حملون نے ہندوستان کو تہ و بالا کر دیا اور دلی مین دربار بے طور دیکھا، تو فغان دہلی چھوڑ کر باہر چلے گئے، یہی بات گل رعنا مین بھی کہی گئی ہے، لیکن جب ہم احمد شاہ دُرانی کے حملون کی تاریخون کو پیش نظر رکھتے ہین تو ان بیانات مین کچھ الجھاؤ پیدا ہو جاتا ہے، احمد شاہ درانی کا پہلا حملہ محمد شاہ کے زمانہ مین ۱۱۶۰ھ مطابق ۱۷۴۷ء مین ہوا، دوسرا احمد شاہ کے زمانہ مین ۱۱۶۱ھ (مطابق ۱۷۴۸ء) مین ہوا، اس حملہ مین لاہور کے قریب مغل اور دُرانی متصادم ہوئے، لیکن احمد شاہ نے ملتان اور لاہور کے دو صوبے دیکر یہ بلا دور کی، احمد شاہ کے زمانے مین دُرانیون کا پھر کوئی حملہ نہ ہوا، وہ ۱۱۷۲ھ (مطابق ۱۷۵۹ء) مین ہندوستان پھر آئے، اور مرہٹون کی قوت پر ایسی کاری ضرب لگائی، کہ ان کی بڑھتی ہوئی طاقت پھر نہ سنبھل سکی، اب اگر یہ مان لیا جائے کہ فغان نے درانیوں کے حملہ کی طوائف الملوکی مین دہلی چھوڑی تو انھون نے یا تو ۱۱۶۱ھ یا ۱۱۷۲ھ کے بعد دہلی چھوڑی ہوگی، اگر ۱۱۶۱ھ کے بعد وطن ترک کیا تو گویا معزولی کے پانچ برس بعد تک دہین قیام پذیر رہے، جس کو یقین کرنا ذرا مشکل ہے، چنانچہ مصحفی کا یہ بیان کہ فغان نے احمد شاہ کی قید کے بعد دہلی چھوڑی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے، اتفاق سے فغان نے اپنے دیوان مین ایک جگہ خود اس کے متعلق اشارہ کیا ہے، دہلی چھوڑنے کے بعد وہ اپنا دردناک حال لکھتے ہین

[51] تذکرہ ہندی مؤلفہ غلام ہمدانی مصحفی انجمن ترقی اردو ص ۱۷۰، [52] مجموعہ نغز حصہ دوم ص ۲،

لکھے شرح غم گر دلِ دردناک — تو اپنی زبان کلک کرتی ہے چاک
میرے شعلۂ آہ پر کر نگاہ — بہاتی ہے چشموں سے اشکِ سیاہ
نپٹ سخت ہے ماجرا درد کا — دلِ سرد کا اور رُخِ زرد کا
بیاں سے بجا ہے کہ خاموش ہوں — کسی سے نہ یہ راز اپنا کہوں
ولیکن چھپانا اسے بے حجاب — کہ یہ راز روشن ہے جوں آفتاب
سنو اے عزیزاں حکایت کے تئین — گرفتارِ غم کی روایت کے تئیں

اور یہ حکایت فغان کے محبوب آقا اور رضاعی بھائی احمد شاہ کی ہے جس سے اُن کی محبت عشق کے درجہ تک پہنچ گئی تھی،

جہاں میں مرا ایک دلدار تھا — اوسی سے مجھے توشہ کار تھا
نہ کچھ کام تھا مجکو گلزار سے — نہ واقف تھا ہرگز گل و خار سے
نہ سمجھوں تھا بلبل کے فریاد کو — نہ جانوں تھا مین جور صیاد کو
نہ معلوم تھا مجکو فرہاد بھی — سنا تھا نہ مین قیس ناشاد بھی
اگر ان کا کچھ درد پاتا تھا میں — تو کاہے کو خاطر میں لاتا تھا میں
مجھے دردمندوں سے کیا کام تھا — سدا وصل کے بیچ آرام تھا
جب اس یار پر دھیان کرتا تھا میں — تو یوسف کو قربان کرتا تھا میں
اسی کو میں کہتا تھا ہے ماہتاب — وہی تھا میرا نجم آفتاب
میں پوجوں تھا نت اس صنم کے تئین — نہ سجدہ کروں تھا حرم کے تئیں
وہی ماہ تھا، اور وہی شاہ تھا — غرض کچھ ہی تھا میرا اللہ تھا

شاہ مذکور سے فغاں کے اختلاط و محبت کی شدت ملاحظہ ہو،

سدا سیر تھے مجکو گلزار کے — کہیں طبع خوش ہو میرے یار کے

اگر اتفاقاً وہ نازک مزاج — چلے تھے وہاں سے تو میں لا علاج

یہ کہتا تھا اور وستم گار کے — نہ چھوڑ اس مزے میں تو گلزار کو

اری دیکھ خوش چشم نرگس کا حال — کہ حیرت سے رہ گئی ہے آنکھیں نکال

ارے اے مری جان اس وقت میں — ارے تیرے قربان اس وقت مین

ترا ہنس کے کہنا میں گھر جاؤنگا — مرا رو کے کہنا میں مرجاونگا

یہی مجھ میں اس میں تھا راز دنیاؔ — کوئی اس میں محمود کوئی ایاز

مگر یہ ساری نشاط انگیزیاں اس وقت کافور ہوگئین جب کہ

فلک نے یکایک ستم یہ کیا — دلِ شاد کو داغِ حرماں دیا

شاید اس سے احمد شاہ کی معزولی ہی مراد ہے، اس کے بعد فغاں کا کیا حال ہوا، وہ خود ہی لکھتے ہین :-

نہ پہنچا کوئی وہاں میری داد کو — چلا تب تو میں مرشد آباد کو

آخری شعر سے صاف ظاہر ہے کہ دہلی سے نکلنے کے بعد فغاں مرشد آباد گئے، مگر مصحفی رقمطراز ہین،

"ورا یامیکہ بسبب تفرقہ شاہ از شاہجہان آباد برآمد، بہ طرف پورب گذرانید و معرفت میر محمد نعیم خان کہ ہم مکتب ایشان بود بہ ملازمت نواب شجاع الدولہ بہادر رسیدہ یکے از مقربان گردانید"[1]

فغان کے مذکورہ بالا شعر کے بعد یہ کیونکر یقین کیا جا سکتا ہے، کہ وہ دہلی سے نکلے، تو سیدھے نواب شجاع الدولہ کے یہان پہنچے، نواب موصوف اپنے باپ صفدر جنگ کے جانشین ۱۱۶۷ھ ہجری یعنی احمد شاہ کی معزولی کے سال مین ہوئے ظاہر ہے کہ فغان کی حمیت نے یہ گوارا نہ کیا ہوگا، کہ اپنے شفیق اور جان نثار

[1] تذکرہ ہندی ص ۱۷۰

رضاعی بھائی کے قید خانہ جاتے ہی وہ ایک دوسرے فرمانروا کی آستان بوسی کے لئے پہنچ جاتے، اس بے بسی کے عالم میں دہلی کو چھوڑا ہوگا، تو بزرگون کے پاس مرشد آباد چلے گئے ہون گے، اس زمانہ مین دہلی اور اودھ کے بعد شاعری کی بزم عظیم آباد اور مرشد آباد مین جمتی تھی، مگر مرشد آباد مین زمانہ نے فغان کا ساتھ نہ دیا، وہ وہان سے واپس ہوئے، تذکرہ گلشنِ ہند مین ہے کہ وہ پھر شاہجہان آباد آئے، اوس کی اصل عبارت ملاحظہ ہو،

"دلی سے مرشد آباد میں اپنے چچا کے پاس کہ محمد ایرج خان کرکے مشہور تھے، وارد ہوئے، لیکن نہ رہے، اور تھوڑے ہی دنون مین پھر شاہجہان آباد چلے گئے، بعد کئی برس کے عظیم آباد مین آئے اور بود و باش کے وہان ٹھہرائے"[1]

اس واپسی کے بعد معلوم نہین ان کا قیام دہلی مین کتنے دنون رہا، صاحب گلشنِ ہند کے "کئی برس" کی مدت مین دُرّانیون کے آخری حملہ (۱۱۷۲ھ) کا سال شامل کر لیا جائے، تو میر قدرت اللہ قاسم اور ان کے ہم نوا مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا عبد الحئی کا یہ بیان کہ دُرّانیون نے جب دلی کو تہ و بالا کر دیا، تو فغان نے پریشان ہو کر دلی کو خیرآباد کہا، صحیح ہو سکتا ہے مگر نواب علی حسن خان نے اپنی صبحِ گلشن مین معلوم نہین، کس سند پر لکھا ہے کہ فغان ۱۱۷۰ھ مین عظیم آباد پہونچ گئے تھے، ان کی اصلی عبارت ملاحظہ ہو،

"ہمینکہ از وطن برید و دراوده رسید، رفاقت نواب وزیر شجاع الدولہ بہادر گزید گو آخر ساز مصاحبت کوک نگردید پس از انجا در سنہ سبعین و مایہ والف صوب عظیم آباد رسید"[2]

اگر ہم اس تاریخ کو صحیح مان لین تو یہ قیاس غلط ہوگا، کہ فغان جب دوسری بار شاہجہان آباد واپس آئے، تو پھر دُرّانیون کے آخری حملہ ۱۱۷۲ھ کے بعد نکلے، اور اگر غلط سمجھ لین، تو پھر بہت ممکن ہے کہ انھون نے دوسری بار دُرّانیون کے حملہ کے بعد ہی دلی چھوڑی،

[1] گلشنِ ہند ص ۱۳۱ [2] ” صفحہ ۱۳۱،

بہرحال دوسری بار دہلی سے نکلنے کے بعد فغاں نواب شجاع الدولہ کو دربار میں پہنچے، صاحب گلشن بیخار نے ان کے نواب موصوف کے یہان پہنچنے کا مطلق ذکر نہین کیا ہے، شاید اختصار سے کام لیا ہے، مصطفیٰ خان کے یہان تو یہ اختصار اور بھی بڑھ جاتا ہے، وہ لکھتے ہین :-

"ازین (یعنی شاہجہان آباد سے) نقل و حرکت کردہ بہ عظیم اباد سکونت اختیار کردہ"[51]

مخزن نکات مین شیخ قائم کا بیان اور بھی ژولیدہ ہے،

"دراین ایام در دارالامان ہندوستان گردسیمہ آفات دشاہراہ بیتاب است بپاس آبروئے خویش بنگالہ گزیدہ ہمانجا رخت اقامت انداخت"[52]

مگر فغان کا اودھ پہنچنا اور نواب شجاع الدولہ کی ملازمت سے منسلک ہونا یقینی ہے، نواب موصوف نے ان کو نہایت اعزاز وکرام سے اپنے یہان رکھا، اور اُن سے بہت زیادہ بے تکلف ہو گئے، ایک روز اسی بے تکلفی مین انھون نے گرم پیسے سے ان کا ہاتھ جلا دیا، فغان کو نواب کا یہ مذاق پسند نہ آیا، اور اُن کی صحبت سے کنارہ کش ہو گئے،

مصحفی لکھتے ہین :-

"دو ہمان نزدے روزے نواب وزیر دستش را در عالم اختلاط بہ فلس سوختند، آب در دیدہ گردانید، و ہیچ نگفت، وآخر بہمین حرکت آزردہ شدہ بہ طرف عظیم آباد رفت،"[53]

مگر محمد حسین آزاد کا بیان ہے کہ ایک دن اختلاط مین ان کا کپڑا نواب صاحب کے ہاتھ سے جل گیا، اور رنجیدہ ہو کر عظیم آباد چلے گئے، وہان جا کر انھون نے زیادہ عزت پائی،[54] کپڑا جلنے کی روایت کسی تذکرہ مین میری نظر سے نہین گذری، مولانا عبد الحئی بھی گل رعنا مین آزاد کے اس بیان کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہین، کہ معلوم نہیں، کپڑا جلنے کی روایت کہان سے لی ہے، مصحفی نے ہاتھ جلنے کا ذکر

کیا ہے، اور یہی صحیح ہے،[55]

فغان فیض آباد سے چلے تو عظیم آباد پہنچے، یہان راجہ شتاب راے کا دربار علمی قدردانی اور فیاضی کے لئے مشہور تھا، شتاب راے نے فغان کو اپنے یہان بلا کر اپنے دربار کی زینت بڑھائی، صبح گلشن مین ہے :-

"راجہ شتاب راے ناظم صوبہ بہار باوصافش بے بردہ بمنادمت خودش کشید"[56]

شتاب راے مغلیہ حکمرانون کا نمک خوار تھا، اُس نے جذبۂ وفاداری مین اپنے آقا کے رضاعی بھائی کی وہ پوری تعظیم وتکریم کی، جس کے فغان مستحق تھے، اس کے علاوہ خود بہت ہی علم پرور اور ہنر دوست تھا، فغان کے کمال ذاتی، شیرین کلامی، اور علم مجلسی کے سبب نہایت عزیز رکھنے لگا،

نواب علی حسن خان صاحب اپنے تذکرہ مین لکھتے ہین کہ یہین فغان کو راجہ شتاب راے کی وساطت سے شاہ عالم کی طرف سے ظریف الملک کا خطاب ملا :-

"راجہ شتاب راے ...... از حضور شاہ عالم بادشاہ خطاب ظریف الملکی وچندے بطریق التمغا بوی دہانید، ازان زمان اشرف علی خان عظیم آباد را توطن برگزید"[57]

نواب صاحب کو لکھتے وقت شاید غلط فہمی ہوئی، کیونکہ اوپر ہم مستند اور معاصر تذکرہ نویسون کے بیان پڑھ چکے ہین کہ یہ خطاب احمد شاہ نے دیا،

بعض تذکرون مین ہے کہ راجہ شتاب راے کی قدردانی مین فغان نے باقی عمر خوشحالی سے بسر کی، لیکن محمد حسین آزاد لکھتے ہین کہ کچھ دنون کے بعد فغان کے تعلقات راجہ صاحب سے قائم نہ رہے، اس کی بنیاد یہ ہوئی کہ احمد شاہ دُرّانی نے سلطنت پر حملے کئے، ایک دن اس کی دست درازی اور بے اعتدالیون کا ذکر ہو رہا تھا، خدا جانے طنز سے یا سادہ مزاجی سے راجہ صاحب نے کہا کہ نواب صاحب!

ملکۂ زمانی کو احمد شاہ دُرّانی کیوں کر لے گیا، انھیں یہ بات ناگوار ہوئی، افسردہ ہو کر بولے کہ جمارا جس طرح سیتا جی کو راون لے گیا تھا، اسی طرح وہ لے گیا، اُس دن سے دربار مین جانا چھوڑ دیا،[1]

آزاد کو معلوم نہین یہ روایت کہان سے ملی؟ اس کے بعد آزاد کا بیان ہے کہ فغان نے حکام فرنگ کے یہان رسائی پیدا کی، اور اُن کے فیض سے باقی عمر فارغ البالی اور خوش حالی مین گذاری، اس کی تائید مجموعۂ نغز کی مندرجہ ذیل عبارت سے ہوتی ہے،

"و بحسن سلیقہ کہ داشت بسران فرنگ درساخت و درہمان نواح رشتۂ زندگانی وے در گسست، و بجوار رحمت حق در پیوست"[2]

گلشنِ ہند اور سخنِ شعرا مین فغان کا سنہ وفات ۱۱۸۶ھ لکھا ہے، مگر گلشنِ بیخار میں ۱۱۹۶ھ درج ہے، لیکن یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے، آبِ حیات، اور گل رعنا مین ۱۱۸۶ھ ہی ہے عظیم آباد مین مدفون ہین، مدفن کی جگہ معلوم نہ ہو سکی،

فغان کا مذہب | فغاں مذہباً شیعہ تھے، دیوان کا آغاز حضرت علیؑ کی مدح سے کیا ہے، اس کے بعد حضرت امام موسیٰ رضا کی شان مین ایک قصیدہ لکھا ہے، اس مین بھی حضرت علیؓ سے اپنی محبت کا اظہار جابجا کیا ہے، مثلاً

پہنچا یو تو خاک فغاں کی وہاں صبا | مشہد ہے جس طرف کو میری بوتراب کا
مہر علی ہے دل مین نہ کر خوفِ روزِ حشر | تو لے چلا ہے ساتھ فغاں زادِ راہ کا

گو فغاں ہر ملت کے لوگون سے یکسان تعلقات رکھتے تھے، میر اپنی خود داری کے باوجود جو نخوت و غرور کی حد تک پہنچی ہوئی تھی، اُن کو بہت زیادہ پسند کرتے تھے، وہ لکھتے ہین :-

"بندہ بخدمت او بسیار مربوطم"[3]

[1] آبِ حیات ص ۱۱۵ [2] مجموعۂ نغز ص ۲، حصہ دوم [3] نکات الشعرا ص ۸۰،

میر کا فغان سے گہرا ارتباط رکھنا ان کے اخلاق و ملنساری کی واضح دلیل ہے، علی ابراہیم نے بھی اپنے تذکرہ مین لکھا ہے، کہ

"براقم آثم ربطے داشت"[1]

میر حسن بھی لکھتے ہین کہ

"خوش اختلاط بود با ہر کس خوش طبعی داشت"[2]

انداز طبیعت | ان کے ملنے والے ان کی بذلہ سنجی، لطیفہ گوئی اور حاضر جوابی سے بہت لطف اٹھاتے تھے، اور کے مشہور تذکرہ گلشنِ ہند کے مصنف کا بیان ہے، کہ

"آٹھ پہران کو خوش طبعی اور خوش اختلاطی سے کام تھا، کوکے تھے احمد شاہ بادشاہ کے، مربّی گری ظرافت کی ندیم تھے جہان پناہ کے، چنانچہ ظریف الملک کوکے خان بہادر حضور سے بادشاہ کا خطاب پایا تھا، اور مرتبہ کو شوخی کے ساتھ لطیفہ سنجی کے بہت دور پہنچایا تھا"[3]

میر صاحب بھی رقم طراز ہین کہ

"طبع او مائل لطیفہ بسیار است چنانچہ ناگر مل راکہ دیوان تن در دخیل بادشاہت گھی کی منڈی کا ساند گفتہ ہر کہ دیدہ دیدہ باشد فہمیدہ باشد و حکیم معصوم را در دربار معلے گاؤ گجراتی نام کردہ، ہر کہ حکیم صاحب را بیند داند"[4]

تمام تذکرہ نویسون نے ان کی ظرافت اور خوش طبعی کا ذکر کیا ہے، سید فتح علی حسینی گردیزی لکھتے ہین کہ

"وضع ظریفانہ دارد"[5]

چمنستانِ شعرا مین ہے :-

[1] گلزارِ ابراہیم ص ۲۴۴ [2] تذکرۂ میر حسن ص ۱۴۲ [3] گلشنِ ہند ص ۳۰ [4] نکات الشعرا ص ۴ [5] تذکرۂ ریختہ گویان ص ۲۰۱

"و اکثر گاہ چمنستان قلوب را از نسیم لطیفہ گوئی و ظرافت مطرائی نمود"[50]

میر حسن کا بیان ہے کہ

"از ہنگامہ آرایان زمان و ظرفائے دوران خوش طبع و شیرین بیان اشرف علی خان المتخلص بہ فغان

کوکہ احمد شاہ بادشاہ غفران پناہ خان ظریف طبع و خوش اختلاط بود، با ہر کس خوش طبعی داشت،

شاعر مربوط بطور خود لطائف و ظرائف او مشہور است"[51]

مجموعۂ نغز میں ہے،

"نہایت یار باش و خیلے ظریف الطبع لطیف مزاج سراسر سرور، سر بسر ابتہاج بود"[52]

نساخ نے بھی سخن شعرا مین لکھا ہے کہ بڑے ظریف تھے،[53] محمد حسین آزاد نے گل افشانی کی ہے کہ ان

کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ تیزی اور طراری کو اُن کے مزاج سے وہ لگاؤ تھا، جو بارودت اور

حرارت کو ۔۔۔ لطیفہ گوئی اور حاضر جوابی زبان میں ایسی تھی جیسی تلوار میں جوہر" اس کے بعد ایک لطیفہ

نقل کیا ہے، جو اگرچہ بہت مشہور ہے، لیکن محض ناظرین کے تفنن طبع کے لئے آزاد ہی کی زبان مین ہم

اس کو سناتے ہین، فغان نے ایک دن راجہ نتاب رائے کے دربار مین ایک غزل پڑھی جس کا قافیہ

تالیان، جالیان، سب سخن فہمون نے بہت تعریف کی، راجہ صاحب کی صحبت مین جگنو میان

ایک مسخرے تھے، اُن کی زبان سے نکلا کہ نواب صاحب! سب قافیے آپ نے باندھے، مگر تالیان رنگین

انھون نے ٹال دیا، اور کچھ جواب نہ دیا، راجہ صاحب نے خود فرمایا کہ نواب صاحب سنتے ہو؟ جگنو میان

کیا کہتے ہین؟ انھون نے کہا کہ مہاراج اس قافیہ کو مبتذل سمجھ کر چھوڑ دیا تھا، اور حضور فرمائین تو

اب بھی ہو سکتا ہے، مہاراج نے کہا ہان کچھ کہنا تو چاہئے، انھون نے اسی وقت پڑھا،

جگنو میان کی دم جو چمکتی ہے رات کو   سب دیکھ دیکھ اس کو بجاتے ہین تالیان

[50] چمنستان شعرا از لچھمی نراین شفیق ص ۱۸۱ [51] تذکرہ میر حسن ص ۱۴۲ [52] مجموعۂ نغز [53] سخن شعرا ص ۳۶۵

تمام دربار چمک اٹھا اور میان جگنو مدھم ہو کر رہ گئے[1]

نواب علی حسن خان نے بھی اپنے تذکرہ صبحِ گلشن مین فغان کی بذلہ سنجی کی تعریف ان الفاظ

مین کی ہے :-

"بسکہ مزاجش مزاح و ظرافت رامی پسندید، از کلام طیبت انگیز احدی از اعالی و اسافل

نمی رنجید گوینہ ہر گاہ، مکانش برفعت و وسعت معمور و مرتب گردید، و بزم نشاط چید"[2]

اس بزم نشاط کا ایک لطیفہ نواب صاحب موصوف نے بھی نقل کیا ہے، جو ذرا غیر سنجیدہ ہے،

اس لئے ہم اس کو نظر انداز کر دیتے ہین، (باقی)

[1] آب حیات صفحہ ۱۱۵، [2] صبحِ گلشن، صفحہ ۳۱۹،

اعلان

اب تک ہم نے باوجود مشکلات کے مطبوعات دار المصنفین اور معارف کی قیمتوں میں

کوئی اضافہ نہین کیا تھا، اور دار المصنفین کی قدیم وضعداری کو قائم رکھنے کی کوشش کی تھی،

لیکن کنٹرول پیپر کی کمیابی اور بیرونی کاغذ کی غیر معمولی گرانی کے باعث اب معارف کی قیمت

مین اضافہ ناگزیر ہو گیا ہے، اس لئے جنوری ۴۸ء سے معارف کی سالانہ قیمت بجائے ۵ر

کے ۶ر کر دی گئی ہے، غیر مستطیع طلبہ اور قومی انجمنون کے لئے رعایتی قیمت ۵ر سے کم نہ

ہو گی، امید ہے کہ دار المصنفین کے ہمدردون اور معارف کے قدر دانون پر یہ خفیف اضافہ

گران نہ ہو گا، اور وہ آیندہ کا وی پی وصول کرتے وقت اس اضافہ کو یاد رکھین گے،

منیجر معارف

فتاویٰ عالمگیری

اور

اس کے چند اور مؤلفین

از جناب مولوی مجیب اللہ صاحب رفیق دار المصنفین

(۳)

اخلاق و عادات شاہ صاحب اخلاق و عادات میں اسلاف کی یادگار تھے، مزاج میں سادگی اور طبیعت میں صفائی اور بے تکلفی تھی، نشست و برخاست، گفتگو و ملاقات، تعزیت و تہنیت، لین دین، خرید و فروخت، تواضع و خاکساری، امداد و اعانت غرض اپنی زندگی کے ہر کام میں وہ نمونۂ عمل تھے اور ان کا کوئی کام حکمت، اداے سنت یا خدمت خلق کے جذبہ سے خالی نہیں ہوتا تھا، فرمایا کرتے تھے کہ

کار عاقلاں و حکیماں آنست کہ استیفاے لذت فقط مقصود نباشد بلکہ باید کہ آن در ضمن دفع حاجتے یا اقامت فضیلتے، یا اداے سنت واقع شود، (انفاس ص۴۵)

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کسی شخص کو سنت یا تعامل کے خلاف کوئی کام کرتے دیکھتے تھے تو بڑی نرمی اور شفقت سے منع کرتے تھے، انفاس میں ہے:

اگر نصیحت میخواستند بنہایت رفق و لین ادا مینمودند (ص۴۵)

جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ان کی نصیحت لوگوں پر بہت جلد اثر انداز ہو جاتی تھی،

آپکے ایک ملنے والے کو جو علم و فضل سے بھی بہرور تھے، فضول گوئی کی عادت تھی، شاہ صاحب نے ایک دن ان سے بڑی شفقت سے فرمایا، اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت و تعلق چاہتے

ہو تو اس عادت کو ترک کردو، ورنہ اس دربار سے فیض نہیں پہنچ سکتا، آپ کی یہ بات ان کے دل میں گھر کر گئی، اور انھوں نے وہ عادت چھوڑ دی،

اگر کسی کو نیک بات کی تلقین کرتے تو اس میں ملائمت کے ساتھ ساتھ مخاطب کی صلاحیت کو بھی ملحوظ رکھتے تھے۔

امر معروف و نہی منکر در مسائل غصوصہ بشرط ظن قبول برفق ولین میکردند، ص۴۵[1]

عام فائدہ کے لیے جمعہ کے دن وعظ بھی فرمایا کرتے تھے، شاہ ولی اللہ صاحب نے لکھا ہے کہ اس میں اجنبی بھی شرکت کرتے تھے[2]، زیادہ تر مشکوٰۃ، تنبیہ الغافلین، غنیۃ الطالبین اور آخر میں تفسیر وعظ کا معمول تھا،[3]

آپکے احباب ملنے آتے تو رخصت کرتے وقت ان کے سامنے یہ شعر بطور وصیت پڑھا کرتے تھے،

آسایش دو گیتی تفسیر این دو حرف است ... با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

خانہ داری کی ضروری خرید و فروخت خود کرتے، باوجود تنگی کے زندگی بھر کبھی قرض نہیں لیا اور تعیش و تنعم کے لیے جو لوگ قرض لیتے تھے ان کو بیحد ناپسند کرتے تھے، اور اس سے باز رکھنے کی کوشش کرتے تھے،

کھانے پینے میں مشتبہات سے بھی گریز کرتے تھے، ایک مرتبہ رمضان میں ان کے استاذ مرزا زاہد نے ان کی دعوت کی، اتفاق سے اسی وقت ایک کبابی آیا، اسے مرزا صاحب سے کچھ کام تھا، جس کے لیے اس نے کباب کا ایک خوان بطور نذر کے پیش کیا، مرزا صاحب قبول نہیں کرتے تھے، لیکن جب اس نے بہت اصرار کیا تو ایک شاگرد سے کہا کہ قیمت لگا کر اسے رکھ لو، شاگرد نے کئی روپے کے کبابوں کی قیمت مرلگائی اور کبابی راضی ہو گیا، شاہ صاحب نے مرزا صاحب سے آہستہ سے کہا کہ آپ رشوت سے بچنا چاہتے ہیں مگر کئی روپے کے کباب مرمیں دے دینا علت سے خالی نہیں ہے، اگر غرض نہ ہوتی تو وہ کبھی راضی نہ ہوتا،

[1] انفاس ص۴۵، [2] انفاس رحیمیہ ص۴۹ [3] انفاس ص۸۶،

شاہ صاحب کے اس کہنے پر مرزا صاحب نے شاگرد کو بلوا کر ڈانٹا، اور کبابوں کی پوری قیمت دلوائی[1] اس کے بعد ان کبابوں سے افطار کیا، شاہ ولی اللہ صاحب نے ان کے اخلاق و عادات کے متعلق جستہ جستہ بہت کچھ لکھا ہے، ایک جگہ جامع طور پر لکھتے ہیں:-

حضرت ایشان باخلاق سلیمہ مرضیہ از شجاعت و فراست و کفایت و غیرت بحدِّ تمام متصف بودند عقل معاش مثل عقل معاد کامل و وافر داشتند و در ہر امر توسط دوست می داشتند، (انفاس ۵۸)،

شاہی دربار اور امراء سے احتراز شاہ صاحب امراء اور سلاطین سے ہمیشہ محترز رہے، شاہ ولی اللہ صاحب نے لکھا ہے کہ "والد صاحب نے امراء کے پاس جانے اور ان سے ملاقات کرنے کی رسم بالکل اٹھا دی تھی لیکن اگر ان میں سے خود کوئی آ جاتا تھا تو اس سے وہ کج خلقی بھی نہیں برتتے تھے، بلکہ اعزاز و اکرام سے پیش آتے تھے اور اگر وہ نصیحت کی خواہش کرتے تھے تو نہایت ہی رفق و تلطف سے دو چار کلمۂ خیر کہہ دیا کرتے تھے۔" (انفاس ۵۸)

اوپر ذکر آ چکا ہے کہ فتاویٰ کی تالیف کے سلسلہ میں شاہی ملازمت کو کس کشمکش کے بعد قبول کیا تھا، اور جب اس سے تعلق منقطع ہوا تو کس قدر مسرور ہوئے اور شکرانہ ادا کیا، اس کے بعد جب شاہ عالمگیر نے زمین دینی چاہی تو اسے بھی قبول نہیں کیا،

عالمگیر ہی کا ایک دوسرا واقعہ یہ ہے کہ شاہ صاحب کے ماننے والوں میں ایک صاحب عالمگیر کے دیلمی تھے، انھوں نے کسی موقع سے اس کے سامنے شاہ صاحب کے فضائل و مناقب کا ذکر کیا، عالمگیر نے ان سے اشتیاق ملاقات ظاہر کیا، انھوں نے بادشاہ سے عرض کیا کہ

بخانۂ ملوک و اغنیاء رفتن طریقہ ایشان نیست، (انفاس ۶۹)

عالمگیر نے شاہ صاحب کے ایک دوسرے مخلص کے ذریعہ ملاقات کا پیغام بھیجا، لیکن شاہ صاحب

---

[1] انفاس ص ۳۳

نے اسے بھی قبول نہیں کیا، ہرچند انھوں نے بہت اصرار کیا، مگر شاہ صاحب کسی طرح راضی نہ ہوئے، جب وہ بالکل مایوس ہو گئے تو شاہ صاحب سے عرض کیا کم از کم آپ ایک رقعہ ہی لکھ دیجئے، تاکہ کوتاہی نہ سمجھی جائے، شاہ صاحب نے ایک کاغذ جس میں آپ کا جوتہ لپٹا ہوا رکھا تھا، لیا اور اس پر یہ عبارت لکھ کر بادشاہ کے پاس بھیج دی:

"جامع اہل اللہ است بر آنکہ بئس الفقیر علیٰ باب الامیر و حق سبحانہ میفرماید

وما متاع الحیٰوۃ الدنیا الا قلیل جز قلیل شمار سیدہ اگر بالفرض بن خواہید او جزء

لا یتجزیٰ خواہد بود برائے ایں جزء لا یتجزیٰ نام خود را از دیوان خدائے تعالیٰ چرا برآرم زیرا کہ

در بعض ملفوظات بزرگان چشتیہ مذکور است کہ ہر کہ نام او در دیوان بادشاہ نوشتہ شد

نام او از دیوان حق سبحانہ بر می آید،"[1]

یہ خط اس بادشاہ کو لکھا گیا ہے جو شاہان تیموریہ میں سب سے زیادہ دیندار اور مذہب کا دلدادہ تھا، اور جس کے ذریعہ "فتاویٰ عالمگیری" جیسا دینی اور اہم کام انجام پایا تھا، اسی طرح ایک مرتبہ عالمگیر کے پوتے عظیم الشان نے ملاقات کی خواہش کی اور شاہ صاحب کے پاس لکھا کہ "اگر آپ خواجہ معین الدین چشتی کی زیارت کے لیے تشریف لے جاتے تو اس بہانہ سے مجھے بھی شرف نیاز حاصل ہو جاتا"، شاہ صاحب نے جواب میں لکھ بھیجا کہ

ان اللہ لا ینظر الیٰ صورکم و اعمالکم	"اللہ تعالیٰ صورت اور اعمال کی طرف نہیں دیکھتا،
وانما ینظر الیٰ قلوبکم و نیاتکم	اسکی نگاہ قلوب اور نیتوں پر پڑتی ہے"، میں
بامثال این امور فریفتہ نمی شوم	اس قسم کی چیزوں پر فریفتہ نہیں ہوتا،

شاہ صاحب کے زمانہ ۱۰۵۴ھ سے ۱۱۳۱ھ میں بڑے بڑے سیاسی انقلابات ہوئے اور کئی

---

[1] انفاس العارفین ص ۶۹، شاہ صاحب کے مکتوبات میں بھی یہ خط کچھ تغیر الفاظ کے ساتھ موجود ہے،

سلاطین بدلے جنھوں نے دعا و برکت کے بہانے شاہ صاحب کی حمایت و ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش کی مگر آپنے ہمیشہ گریز کیا اور ان معاملات سے بہت کم دلچسپی لی،

جب معز الدین جہاندار شاہ پر فرخ سیر نے چڑھائی کی تو معز الدین نے دعاے فتح کیلئے شاہ صاحب کی خدمت میں آنا چاہا، لیکن آپنے اپنے درباری احباب کے ذریعہ یہ کہلا کر اسے روک دیا کہ

"اس کا آنا مناسب نہیں ہے، اس لیے کہ اگر سچ بولوں گا تو وہ ناخوش ہوگا اور

اگر جھوٹ بولوں تو فقیروں کا یہ شیوہ نہیں ہے"[1]

اسی طرح فرخ سیر اور سادات بارہہ میں جب ان بن ہوئی تو شاہ صاحب کے سامنے بھی یہ جھگڑا پیش ہوا، آپنے صرف اتنا فرمایا کہ "برائے من ایں راہم چنیں بگذارید" یعنی میری خاطر اس بادشاہ (فرخ سیر) کو اسکے حال میں چھوڑ دو! چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحب کا بیان ہے کہ "والد صاحب جب تک زندہ رہے فرخ سیر کی پر کوئی آنچ نہیں آئی، لیکن ان کی وفات کے پچاس ہی دن کے بعد فرخ سیر کی بساط حکومت الٹ دی گئی اور وہ قید کر لیا گیا"[2]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یا تو شاہ صاحب فرخ سیر کو کسی حد تک پسند کرتے تھے یا اس کے بعد جو فتنہ و فساد ملک میں شروع ہونے والا تھا اسے اپنی زندگی میں دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔

عبادت اور ذکر و اشغال

ذکر و فکر طاعت و عبادت، صلاح و تقویٰ کے اعتبار سے شاہ صاحب کی زندگی نمونہ تھی، انھوں نے فرائض کے علاوہ نوافل و مستحبات میں بھی اپنا جو معمول بنا لیا تھا، ان پر ہمیشہ مستقیم رہے، اور عذر شرعی کے علاوہ انھیں کبھی ترک نہیں کیا، ان کی زندگی کا اصول تھا کہ الاستقامۃ خیر من الکرامۃ" (احکام الٰہی پر استقامت کرامت سے بڑھ کر ہے)" انھوں نے شیخ محمد جیو کو ایک خط میں لکھا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے پانچ چیزیں عطا کی ہیں، تم بھی ان پر قائم رہو، ان میں سے[3]

[1] انفاس ص ۔ [2] ایضاً [3] وہ پانچ چیزیں یہ ہیں الذکر والتقوی علی کل حال، وایصال النفع للخلق

(باقی حاشیہ صفحہ ۴۳ پر)

ایک یہ ہے کہ الذکر والتقوی علی کل حال یعنی ہر حال میں ذکر و تقوی پر استقامت، اسلیے آپکی زندگی کا کوئی لمحہ ذکر و تقوی پر استقامت سے خالی نہیں تھا، ذیل کے واقعات سے اس کا اندازہ ہو سکے گا۔

ہمیشہ نماز باجماعت پڑھتے تھے۔ عذر شرعی کے علاوہ کبھی اسے ترک نہیں کیا، نماز کی پابندی کا حال یہ تھا کہ جس شب آپ کا انتقال ہوا تو نفس بازپسیں سے کچھ دیر پہلے دریافت کیا، صبح صادق ہوئی یا نہیں؟ حاضرین نے نفی میں جواب دیا، آپنے فرمایا کہ میرا رخ قبلہ کی طرف کر دو، لوگوں نے اس کی تعمیل کی اور آپ نے اشارہ سے نماز ادا کی، اسی طرح وفات سے چند مہینہ پہلے رمضان کا مہینہ آگیا، آپ بتقاضاے عمر اور علالت کی وجہ سے کمزور ہو چکے تھے، اور آپکے لیے شرعی رخصت بھی موجود تھی لیکن آپنے اس سے فائدہ اٹھانا گوارا نہ کیا اور پورے روزے رکھے، آپ کی اہل خانہ نے افطار کے لیے اصرار کیا تو فرمایا کہ "بس یہی تو ہوتا ہے کہ کمزوری کی وجہ سے بیہوش ہو جاتا ہوں تو یہ میرے لیے کوئی نئی بات نہیں ہے، بیہوش رہنے کا تو عادی ہو چکا ہوں"[1]، شاہ صاحب کے خاص خاص معمولات یہ تھے:

تہجد، اشراق اور چاشت کا خاص اہتمام تھا، لیکن تہجد میں رکعتوں کی تعیین نہیں تھی، بلکہ حضور ذہن اور نشاط کے ساتھ جتنی رکعتیں ہو جاتی تھیں پڑھ لیا کرتے تھے، نماز مغرب کے بعد دو رکعت نفل والدین اور اپنے بڑے بھائی کے ایصال ثواب کے لیے پڑھتے تھے،

تلاوت قرآن روزانہ کا معمول تھا اور اسے بڑی خوش الحانی، سوز و گداز اور تجوید کے ساتھ پڑھتے تھے، دن میں ایک ہزار بار درود شریف اور ایک ہزار بار نفی و اثبات، بارہ ہزار مرتبہ اسم ذات کا ورد کرتے تھے، اور گیارہ بار سورہ مزمل اور گیارہ سو بار یا مغنی غنا ظاہری کے لیے پڑھتے تھے، درود

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۲) من غیر تفرقۃ وعدم تفضیل نفسہ علی احد من الخلق والتواضع لامر اللہ وخلق اللہ (ہر حالت میں ذکر و تقوی (مومن و کافر، حیوان و انسان) کی تفریق کے بغیر مخلوق کی نفع رسانی اور اپنے نفس کو افضل نہ سمجھنا، اور خدا کے حکم کے آگے جھکنا اور اسکی مخلوق سے تواضع کے ساتھ پیش آنا۔ [1] انفاس العارفین اور انفاس رحیمیہ،

سے خاص عشق تھا، فرمایا کرتے تھے کہ

ہرچہ یافتیم بدولت درود و توجہ مجرد یافتیم، (انفاس ص۲۰)

حکیمانہ مقولے شاہ صاحب کے ملفوظات اور مکتوبات میں سیکڑوں حکیمانہ جواہر پارے بکھرے ہوئے ہیں ہم ان میں سے چند فقرے جن کا تعلق معاملات سے ہے نقل کرتے ہیں، آداب مجلس کے متعلق فرماتے تھے کہ

در مجلس ہرگز نکوہش قومی مکن مگو کہ اہل پورب چنین اند و اہل پنجاب چنیں و افغانان چنیں، شاید دراں میاں مردے باشد از آن قوم یا از اہل حمیت آں قوم بر برد و صحبت منغص شود

عام مجلس میں کسی خاص قوم کو ملامت نہ کرو، یہ نہ کہو کہ اہل پورب ایسے ہیں اور اہل پنجاب ویسے ہیں اور افغان اس طرح کے ہیں، ممکن ہے کہ اس قوم کا کوئی عام آدمی یا کوئی اہل غیرت شخص موجود ہو اور وہ برا مانے اور مجلس میں بے لطفی پیدا ہو،

ایک مرتبہ فرمایا کہ

ہرگز سخنے مخالف جمہور در مجلس عام بزبان میار اگرچہ فی نفسہ صحیح باشد کہ ایشان برآں انکار کنند و صحبت منغص شود

جو بات جمہور کے خلاف ہو اسے ہرگز مجلس عام میں نہ کہو اگرچہ وہ صحیح ہی کیوں نہ ہو کیونکہ لوگ رد و قدح کرینگے اور مجلس میں تکدر پیدا ہوگا،

فرمایا کہ

در مجلس عام برکسے رد صریح مکن

مجلس عام میں کسی شخص کی کھلم کھلا تردید نہ کرو

فرمایا کہ

اگر آنانکہ منزلت ایشان از منزلت تو فرو تر است ابتدا بسلام کنند آنرا نعمتی از نعم

جو لوگ تم سے کم مرتبہ کے ہیں وہ اگر پہلے سلام کریں تو اس کو خدا کی نعمت سمجھو اور اس پر

الٰہی شناس و شکر آن بجا آرود روی ایشان منبسط شو و تفقد حال ایشان کن لہا می باشد ادنی التفاتے کہ نزدیک تو ہیچ قدر ندارد در چشم ایشان عظیم نماید ..... و اگر آن را نیابند محزوں شوند

اس کا شکر ادا کرو، اور ان سے خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آؤ اور ان کی مزاج پرسی کرو، اسلیے کہ بسا اوقات ایک ادنی التفات جسکی تمھارے نزدیک کوئی قیمت نہیں ہو ان کے نزدیک اسکی بڑی عظمت ہوتی ہے، ..... اور اگر

فرمایا کہ

اگر ترا با کسے حاجتے باشد بر وتمہید شایستہ کن و تدریج نما در طلب آں حاجت، و نباید کہ سخن مثل سنگ اندازی

اگر تم کو کسی سے کوئی ضرورت پیش آجائے تو عمدہ پیرایہ اور تدریجی طور سے اسکا اظہار کرو یہ نہ ہو کہ بات پتھر کی طرح مار دو،

والدین کی خدمت کے بارے میں فرمایا لوگ سمجھتے ہیں کہ اس سے عہدہ برآ ہونا بہت مشکل کام ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ بہت آسان ہے، اس لیے کہ

ایشان باونی خاطر جوئی رضامند میشوند وانذکے را بسبب غایت شفقت بسیاری شمروند

والدین تھوڑی سی دلجوئی سے بھی راضی ہو جاتے ہیں اور غلبۂ شفقت کی وجہ سے تھوڑی سی خدمت کو بھی بہت سمجھتے ہیں۔

در مخاطبہ بزرگان سخن مغلق و موجز و آہستہ گفتن روا نیست

بڑوں سے گفتگو کرنے میں مغلق، مختصر اور آہستہ بات نہیں کرنا چاہیے،

در سخن گفتن و راہ رفتن و نشستن و برخاستن برسم اقویا و عادت ایشان کار کن اگرچہ ضعیف باشی،

بات چیت کرنے، راستہ چلنے اور نشست و برخاست میں قوی لوگوں کی عادت اختیار کرو خواہ ضعیف ہی کیوں نہ ہو،

وضع اور لباس کے متعلق فرماتے ہیں:

باید کہ لباس وزی مرد مشعر باشد — آدمی کا لباس اور اسکی وضع ایسی ہونی چاہیے

بصفت کمال وی مثلاً کسے کہ دانشمند — کہ اس سے اس کے صفت کمال کا پتہ چل جائے،

است باید لباس دانشمنداں پوشد — مثلاً اگر کوئی فقیہ یا فلسفی ہے تو اسکو انھیں جیسا

بہ آئین ایشان زندگانی کند و آنکہ — لباس پہننا چاہیے اور انھیں جیسی زندگی گذارنی

فقیر است باید لباس فقیراں پوشد — چاہیے، اگر کوئی درویش ہو تو اسے اہل فقر ہی جیسا

وبہ آئیں ایشان زندگانی کند — لباس اور انھیں جیسا رہن سہن اختیار کرنا چاہیے؛

اولاد شاہ صاحب کی دو شادیاں ہوئی تھیں، پہلی زوجہ کے متعلق یہ نہیں معلوم ہوسکا کہ وہ کسکی صاحبزادی اور کس خاندان سے تھیں، ان کے بطن سے ایک صاحبزادے صلاح الدین پیدا ہوئے، جب شاہ صاحب کا سن ساٹھ برس کا ہوا تو بعض غیبی بشارتوں[1] کی بنا پر انھوں نے دوسری شادی شیخ محمد پھلتی[2] کی صاحبزادی سے کی، ان نیک بخت خاتون[3] کے بطن سے دو صاحبزادے شاہ ولی اللہ اور شاہ اہل اللہ[4] پیدا ہوئے، اور

---

[1] اس غیبی بشارت کا تذکرہ شاہ ولی اللہ صاحب نے انفاس العارفین میں دو جگہ کیا ہے، ایک جگہ فرماتے ہیں بر ایشان منکشف ساختند تقدیر بران جاری شد کہ ایشان را فرزند دیگر موجود آید ...... و آن مولود بغلان و فلاں مقام خواہد رسید داعیہ تزوج بخاطر ایشان پیدا شد" صـ ۳۲ دوسری جگہ خود شاہ عبد الرحیم صاحب کی زبانی فرماتے ہیں: "میفرمودند دیگر بار بزیارت مرقد منور ایشان (بختیار کاکی) ... قسم روح ایشان ظاہر شد فرمودند ترا پسرے پیدا خواہد شد او را قطب الدین احمد نام کن ...... بعد از زمانے داعیہ تزوج دیگر پیدا شد" صـ ۳۲)

[2] شیخ محمد کے اجداد سدھور (بہار) کے رہنے والے تھے، ان کے اجداد میں شیخ احمد نے سکندر لودی کے دربار میں رسوخ حاصل کیا، جس سے ان کو پھلت کے قریب کچھ زمین مل گئی اور وہ سدھور سے پھلت آگئے، یہ خاندان دنیاوی وجاہت کے ساتھ ساتھ علم و فضل میں بھی ممتاز تھا، خود شیخ محمد بڑے برگزیدہ اور مرتاض بزرگوں میں تھے،

[3] شاہ ولی اللہ صاحب کی والدہ ایک رابعہ صفت اور مریم فطرت خاتون تھیں، شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ انکی نسبت توجہ کا حال یہ تھا کہ ایک مرتبہ انھوں نے بیس عورتوں کو بیک وقت توجہ دی، (صـ ۳۲)، ان کی عبادت و ریاضت کے اور بھی واقعات انفاس العارفین میں ہیں۔

[4] شاہ اہل اللہ بھی علم و فضل اور تصوف میں خاندانی روایات کے حامل تھے، انھوں نے شاہ عبد الرحیم صاحب کے مکتوبات کو انفاس رحیمیہ کے نام سے جمع کیا ہے، کتاب کے شروع میں چند سطریں انھوں نے بھی اخلاقیات پر لکھی ہیں، جن سے انکی عظمت اور ولایت کا پتہ چلتا ہے،

ہندوستان میں اسلامی علوم و عرفان کے سرچشمہ بنے۔

ملا ابوالواعظ ہرگامی ملا ابوالواعظ مولانا فضل حق خیرآبادی کے پردادا بھائی تھے، ان کا سلسلۂ نسب بارہویں پشت پر شاہ عبد الرحیم صاحب سے مل جاتا ہے، اور یہ حسن اتفاق ہے کہ اس خانوادہ کے یہ دونوں گوہر شب چراغ فتاوی کی تالیف میں شریک تھے،

نام و نسب ابوالواعظ نام یا کنیت تھی، ان کے والد کا نام قاضی صدر الدین تھا، ننہالی سلسلۂ نسب کا تو علم نہیں ہوسکا، دادیہالی شجرہ حضرت فاروق اعظم تک منتہی ہوتا ہے، پورا شجرہ یہ ہے:۔

ابوالواعظ بن قاضی صدر الدین بن قاضی اسمٰعیل ہرگامی بن قاضی عماد الدین بدایونی بن شیخ ارزانی بن شیخ منور بن خطیر الملک بن شیخ سالار شام بن شیخ وجیہ الملک بن شیخ بہاء الدین بن شیر الملک، شیر الملک کے اوپر ایک دو نام میں اختلاف[1] کے علاوہ پورا شجرہ وہی ہے جو شاہ عبد الرحیم صاحب کے حالات میں درج ہوچکا ہے، شیر الملک کے دو صاحبزادے شمس الدین اور بہاء الدین تھے اور دونوں صاحب علم و فضل اور صاحب وجاہت تھے، اور دونوں ساتھ ہی ہندوستان آئے[2]،

شیخ شمس الدین رہتک کے قاضی ہوئے اور وہیں مقیم ہوگئے، اور شیخ بہاء الدین بدایوں کے قاضی ہوئے اور وہیں متوطن ہوگئے، ان کی اولاد میں شیخ عماد الدین کی شادی قاضی ہرگام (سیتاپور) کی صاحبزادی سے ہوئی، قاضی صاحب کے کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی، اس لیے ان کے بعد قاضی عماد الدین ہی ہرگام کے قاضی مقرر ہوئے، اور اس سلسلہ سے وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی، ان کے بعد ان کے صاحبزادے قاضی اسمٰعیل نے عہدۂ قضا سنبھالا، ان کے بعد ان کے صاحبزادے قاضی صدر الدین یعنی ملا ابوالواعظ کے والد نے ان کی جانشینی کی، قاضی صدر الدین کے دو صاحبزادے اور دو صاحبزادیاں

---

[1] باغی ہندوستان میں ملا ابوالواعظ کا جو شجرہ درج ہے اس میں شیر الملک کے اوپر دو ایک نام شاہ ولی اللہ صاحب کے انفاس العارفین میں دئے ہوئے شجرہ سے مختلف ہیں [2] باغی ہندوستان صـ ۱۲

تھیں، صاحبزادیوں کی شادی گوپامئو اور لاہرپور وغیرہ میں ہوئی تھی، صاحبزادوں میں ایک ملا عبداللہ ہیں جن کی اولاد میں کئی متبحر اور ممتاز عالم گذرے ہیں، مولانا فضل حق خیرآبادی بھی انہی کی اولاد میں تھے، دوسرے صاحبزادے ملا ابوواعظ ہیں، جنھوں نے غالباً عہدۂ قضا کے بجائے درس وتدریس کو اپنا مشغلہ بنایا،

ملا ابوواعظ اپنے وقت کے مشاہیر علماء میں تھے اور عالمگیر کے اتالیق بھی رہ چکے تھے، مگر عام تذکروں میں ان کے حالات نہیں ملتے، مولانا فضل حق خیرآبادی کے والد مولانا فضل امام صاحب (متوفی ۱۲۴۰ھ) نے اپنی کتاب آمدنامہ[۱] میں قصبہ ہرگام کے علماء کے کچھ حالات لکھے ہیں، جس کے کچھ اقتباس ایک کرم فرما[۲] کے ذریعہ مل گئے ہیں، اسی سے ان کے حالات لکھے جاتے ہیں۔

درس وتدریس ملا ابوواعظ کا محبوب مشغلہ درس وتدریس تھا، ان کے درس میں دور دور سے طلبہ اور علماء آکر شریک ہوتے تھے، مولانا فضل امام صاحب نے لکھا ہے کہ

ملا محب اللہ بہاری صاحب سلم ملا ابوواعظ سے درس لینے کے لیے گئے تھے مگر ان کا کوئی وقت خالی نہیں تھا، اس لیے مایوس ہو کر ملا قطب الدین سہالوی کے پاس گئے اور اس چشمۂ علم سے اپنی علمی تشنگی بجھائی،

آمدنامہ میں ایک دوسرا واقعہ ملا قطب الدین سہالوی کا درج ہے کہ

ملا قطب الدین سہالوی ملا ابوواعظ کے پاس علمی بحث ومباحثہ کی غرض سے ہرگام پہنچے، لیکن ملا ابوواعظ نے اس سے گریز کیا اور ان سے فرمایا کہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں،

۱؎ یہ کتاب کچھ فارسی قواعد اور چند علماء کے حالات پر مشتمل ہے قصبہ ہرگام میں یہ کتاب قلمی موجود ہے اس کے کچھ اقتباس سید نجم الحسن صاحب نے بھیجے ہیں یہ حالات انھیں سے ماخوذ ہیں ۲؎ گو یہ اقتباس ہرگام سے سید نجم الحسن صاحب نے بھیجا ہے مگر اس کا اصل ذریعہ جناب عبداللہ بن خان صاحب نیر ولانی مترجم الثورۃ الہندیہ ہیں جنھوں نے اصرار کرکے اسے بھجوایا،

تم نوجوان ہو، اگر مباحثہ میں مجھ پر کوئی کوئی اعتراض وارد ہوا جس کا میں جواب نہ دے سکا تو میرے مرنے کے دن قریب آئے، درس وتدریس تک کا ہوش نہیں اس لیے مجھے کوئی ندامت نہیں ہوگی اور نہ دوسروں کا کوئی نقصان ہوگا، لیکن اگر آپ کے ساتھ یہ بات پیش آجائے گی تو پھر طلبہ کے دل سے آپ کا وقار جاتا رہے گا، اور جو آپ کی ذات سے دوسروں کو فیض پہنچ رہا ہے وہ ختم ہو جائے گا،

ملا قطب الدین نے عرض کیا کہ

مرا داعیہ تلمذ است نہ داعیہ برابری اگر استفادہ خواہم کرد کتاب درمیان خواہم نہاد

اس کے بعد کئی روز تک دونوں بزرگوں کی پرخلوص صحبت رہی،

ملا ابوواعظ عالمگیر کے استاذ بھی رہ چکے تھے، آمدنامہ میں ہے

از استاذان عالمگیر بادشاہ اند،

وفات آپ نے ہرگام ہی میں پوری زندگی بسر کی اور وہیں وفات پائی، تاریخ وفات، اور اولاد واخلاف کی تصریح نہیں مل سکی،

علم وفضل مولانا فضل امام صاحب ان کے علم وفضل کے متعلق لکھتے ہیں،

ملا ابوواعظ ہرگامی از اساطین علماء، وارکین فضلاء بودہ در جمیع علوم دستگاہ بلند وقدرتے تمام داشت،

ملا ابوواعظ کو باطنی ذوق سے بھی حصہ ملا تھا، آمدنامہ میں ہے،

خوارق عادات وکمالات باطنی ملا بسیار نقل کنند،

علمی یادگاریں انھوں نے بہت سی علمی یادگاریں چھوڑی ہیں، ان میں ہدایہ مطول اور ملا جلال کے حواشی خاص اہمیت رکھتے ہیں، ملا جلال کے حواشی کے متعلق مولانا فضل امام صاحب لکھتے ہیں کہ

دیدہ ام بغایت متین نوشتہ بودند واز اں حاشیہ مبلغ علم ملا معلوم می شد،

ایک رسالہ جملہ خبریہ کے متعلق بھی لکھا تھا، اس کے متعلق مولانا فضل امام صاحب فرماتے ہیں،

الحق نہایت خوب است و مرتبہ متین است،

لیکن زمانہ کی دستبرد سے ان کی اکثر کتابیں ضائع ہوگئیں، مولانا فضل امام صاحب ان کتابوں کے ناپید ہونے پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں،

دریغ ولا از کتب ملا شانے یافتہ نمی شود اطارت بہا العنقاء ام غاب بہا العقل

فتاوی میں شرکت | ان سب کے علاوہ ملا ابوالواعظ کا سب سے بڑا کارنامہ اور ان کی قیمتی یادگار فتاوی عالمگیری کی تالیف میں شرکت ہے، آمدنامہ میں ہے،

در تالیف فتاوی عالمگیری شرکت داشتند،

یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ کس حصہ کی تالیف ان کے سپرد تھی اور نہ یہ پتہ چل سکا کہ وہ کسی کے معاون کی حیثیت سے کام کر رہے تھے یا وہ خود کسی حصہ کے ذمہ دار تھے،

تابعین

علم و عمل اور مذہب و اخلاق میں صحابہ کرامؓ کے سچے جانشین اور ان کے تربیت یافتہ تابعین کرامؒ تھے، اور صحابہ کرامؓ کے بعد ان ہی کی زندگی مسلمانوں کے لیے نمونہ عمل ہے، اسلیے سیر الصحابہؓ کی تکمیل کے بعد دار المصنفین نے اس مقدس گروہ کے حالات کا یہ تازہ مرقع مرتب کیا ہے، اس میں حضرت عمر بن عبد العزیزؒ، حضرت حسن بصریؒ، حضرت اویس قرنیؒ، حضرت امام زین العابدینؒ، حضرت امام باقرؒ، حضرت امام جعفر صادق، حضرت محمد بن حنفیہ، حضرت سعید بن مسیب، حضرت سعید بن جبیرؒ، حضرت محمد بن سیرینؒ، حضرت ابن شہاب زہریؒ، امام ربیعۃ الرائےؒ، امام مکحول شامیؒ، قاضی شریحؒ وغیرہ ۹۶ اکابر تابعین کے سوانح، انکے علمی، مذہبی، اخلاقی اور عملی مجاہدات اور کارناموں کی تفصیل ہے، مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی،

ضخامت ۵۷۰ صفحے، قیمت : للعہ

ہندوستان میں علم حدیث

(بطریق تالیف علوم حدیث)

از

مولوی ابویحیٰی امام خان صاحب نوشہروی

(۳)

مشارق الانوار کی ترتیب | جامع مشارق نے اپنی تحقیق کے مطابق اس میں صرف صحیحین کی حدیثیں جمع کیں، اور ترتیب فقہی کے بجائے حروف ہجا کی ترتیب پر مدون کیا، مثلاً مترجم مولانا خرم علی فرماتے ہیں،

"جن حدیثوں کے سرے پر حرف مَن ہے، اول باب میں لایا اور ان کی حدیثوں کو دوسرے باب میں اور جن پر حرف لا ہے، ان کو تیسرے باب میں اور باوجود اس کے پھر حرف تہجی کی رعایت ہے خلاصہ یہ کہ اس میں ترتیب معنوی نہیں، ترتیب لفظی ہے"[۱]

الجھن یہ رہ جاتی ہے کہ باعتبار حرف ہجا پہلے حرف الف کی احادیث ہونا تھیں، نہ وہ کہ جن کا پہلا حرف میم ہے، فرماتے ہیں،

"لیکن جامع رحمہ اللہ نے باب اول میں لفظ مَن کو مقصود نہیں رکھا، بلکہ مَن کے بعد جو لفظ آئے گا جس کے شروع میں الف ہو، چنانچہ پہلی حدیث ہے :-

خ ابوہریرۃ مَن آمن باللہ ورسولہ" الخ[۲]

---

[۱] مقدمہ مشارق الانوار از مولانا خرم علی بلہوری ص ۶ از سطر ۳ [۲] تحفۃ الاخیار ص، باب اول،

"اور دوسری حدیث:

"زید بن خالد الجهنی من آوی ضالة فهو ضال مالم يعرفها"

پہلی حدیث میں مَنْ کے بعد لفظ آمن کا اور دوسری حدیث میں لفظ آوی کا اعتبار کیا گیا ہے،

اور مولانا خرم نے جو یہ فرمایا کہ "باوجود اس کے پھر حروف تہجی کی رعایت ہے، جیسے لغت کی کتابوں میں ہوتی ہے"، تو واقعی اس کا التزام تمام کتاب میں اسی طرح ہے، جیسا کہ حدیث نمبر ۲ کے بعد سے کہ الف ممدودہ کے بعد الف مقصورہ آتا ہے،

اور یہ جو مولانا خرم علی نے فرمایا کہ "اس میں ترتیب معنوی نہیں، ترتیب لفظی ہے الخ" یعنی "تیسرے یہ کہ مصنف بعض حدیث کو ٹکڑے کر کے اپنی ترتیب کے موافق چند مقام پر لایا ہے، اور یہ کام عالم عارف کو درست ہے، بشرطیکہ معنی میں خلل نہ پڑے، چنانچہ مصنف نے ایسا ہی کیا"، اور یہ کیفیت مشارق کے مطالعہ سے نظر آئے گی،

مؤلف کی تبویب کے مطابق مشارق ۱۲ ابواب پر منقسم ہے، گیارہواں باب صرف احادیث قدسیہ میں ہے، جس کی ترتیب از سر نو باعتبار ہجار رکھی گئی ہے،

ان احادیث قدسیہ کی تعداد ۲۶ ہے، بخاری کی (۸) مسلم کی (۱۴) اور متفق فی الصحیحین (۴) ہیں گویا صحیحین میں صرف ۱۴ احادیث قدسیہ ہیں،

چودہواں اور آخری باب "فی جوامع الادعیة" ہے، اس میں نواسی دعائیں ہیں،

یہ بھی ندرت ہو کہ آنحضرت صلوات اللہ علیہ نے جن احادیث میں لفظ والذی نفسی بیدہ یا والذی نفس محمد بیدہ سے قسم فرمائی، امام صغانی نے صحیحین سے ایسی تمام حدیثیں یکجا کر دی ہیں،

۵- الفوائد علی مشارق الانوار، مولانا خرم علی بلہوری م ۱۲۶۰ھ / ۱۸۴۴ء مترجم مشارق الانوار

اول :- الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی محمد سید المرسلین وعلی

آلہ واصحابہ اجمعین" (ص ۲) جو تحفۃ الاخیار ترجمہ مشارق الانوار سے اس طرح ملحق ہے، کہ ص ۲ سے ۴ تک مقدمہ ہے، ہر ایک حدیث کے بعد متن ہی میں اس کا ترجمہ اور ترجمہ سے ملا ہوا فائدہ بہ علامت ف ہے،

مقدمہ میں مولانا خرم علی صاحب ہندوستان میں علوم حدیث کی بے بسی پر فرماتے ہیں،

"ہندوستان میں اس علم حدیث کا چرچا نہیں، عوام کا تو کیا ذکر ہے، اکثر علماء کو خبر نہیں، اس واسطے نہایت مناسب معلوم ہوا کہ کسی حدیث کی کتاب کا ترجمہ عام فہم اردو زبان میں کیجئے، سو سب کتابوں سے مشارق الانوار حسن صغانی کی نہایت پسند آئی، اس واسطے کہ مختصر کتاب ہے، اور اس کی احادیث کی صحت پر اتفاق ہے کوئی اس کی ایسی حدیث نہیں، جو غیر معتبر ہو بخلاف مشکوٰۃ کے کہ اس میں ہر جنس کی روایت ہے صحیح بھی ہے اور ضعیف بھی،

الحمد للہ کہ بارہ سو انچاس ۱۲۴۹ھ مطابق ۱۸۳۳ء میں حسب دلخواہ ترجمہ ہوا، اور تحفۃ الاخیار ترجمہ مشارق الانوار اس کا نام مقرر کیا، حق تعالیٰ اپنے کرم سے اس کتاب کو مقبول کرے اور اہل اسلام کو فائدہ بخشے، اور بھول چوک کو معاف فرمائے، آمین" (ص ۲)

مقدمہ کے بعد "فصل اصطلاحات حدیث میں" ہے، مرتب مشارق (امام حسن) نے صرف صحیحین کی روایات ضبط فرمائی ہیں، مولانا خرم علی نے بھی محدثین میں صرف شیخین (امام مسلم و امام بخاری) کے ضروری سوانح پر اکتفا کیا ہے اور صفحہ (۵) سے صاحب مشارق الانوار (امام حسن) کا سراپا ہے، جو اس انداز سے بیان ہوا ہے کہ سرخیل مصنفین نواب صدیق حسن خاں (م ۱۳۰۷ھ / ۱۸۸۹ء) نے بھی اتحاف النبلاء المتقین باحیاء مآثر الفقہاء المحدثین جیسی فقید المثال کتاب میں صغانی کا ترجمہ اسی مقام سے مستنبط فرمایا[1]، اور آخر مقدمہ میں تحریض علی العمل بالحدیث کے چند اشعار ہیں۔

---

[1] اتحاف النبلاء ص ۲۴۳ فی ترجمہ امام حسن الصغانی اللاہوری۔

کیا تجھ سے کہوں حدیث کیا ہے ! دروازۂ درجِ مصطفےٰ ہے !

نمونۂ فوائد اس حدیث کے ضمن میں ملاحظہ فرمایئے،

ابو هریرة من آمن بالله ورسوله	صحیح بخاری میں ابو ہریرہؓ سے روایت
واقام الصلوٰة وصام رمضان	ہے کہ حضرتؐ نے فرمایا کہ جس نے سچے دل
كان حقا على الله ان يدخله	سے خدا کو اور اس کے پیغمبر کو مانا، اور
الجنة هاجر في سبيل الله او	نماز کو ٹھیک ادا کیا، اور رمضان کا
جلس في ارضه التي ولد	روزہ رکھا، کرم اور فضل کی راہ سے ضرور
فيها[1]	ہو گیا خدا پر اس کا بہشت میں لیجانا،
	خواہ اپنا وطن اس نے خدا کی راہ میں
	جہاد کے واسطے چھوڑا ہو یا اسی زمین[2]

[illegible]

اس حدیث پر حسب ذیل "فائدہ" مکتوب ہے،

"اس حدیث کی پوری روایت بخاری میں ہے کہ اصحاب نے عرض کیا کہ اگر حکم ہو تو ہم لوگوں کو خوشخبری سنا دیں کہ بہشت جہاد اور ہجرت پر موقوف نہیں، حضرت نے فرمایا بہشت میں ایک سو بلند درجے ہیں، کہ خدا نے نمازیوں کے واسطے مقرر کئے ہیں ہر ایک درجے میں اتنا فرق ہے کہ جتنا آسمان اور زمین میں، سو جب تم خدا سے مانگو تو فردوس مانگا کرو کہ فردوس سب بہشتوں کے درمیان ہے، اور سب سے اونچی اور اس کے اوپر خدا کا عرش ہے، اوسی سے بہشت کی سب نہریں نکلی ہیں، یعنی ہر چند جہاد پر بہشت موقوف نہیں، اصل نجات کے واسطے ایمان اور نماز و روزہ کفایت کرتا ہے، لیکن تم ہمت کو پست کرد،

[1] تحفۃ الاخیار ترجمہ مشارق الانوار مولانا خرم علی صاحب ص (۷)

کہ صرف نجات پر قناعت کرو، بلکہ ہمت بلند رکھو، جہاد کرو تاکہ فردوس پاؤ جس کے آگے سب بہشتیں پست ہیں،

اس حدیث میں فرشتوں اور خدا کی کتابوں کا اور تقدیر و قیامت کا ایمان لانا بیان نہیں فرمایا، اس واسطے کہ جب آدمی رسول کا ایمان لایا تو ان کا بھی ضرور ایمان لاوے گا، کہ تمام قرآن و حدیث میں ان کا بیان موجود ہے، اور نماز روزہ کے ساتھ زکوٰۃ و حج کا ذکر نہیں فرمایا، اس واسطے کہ زکوٰۃ و حج صرف مالدار پر فرض ہے، محتاج پر نہیں، اور نماز و روزہ سب پر فرض ہے، مالدار ہو یا محتاج، خلاصہ یہ ہے کہ یہاں حکم عام بیان فرمانا منظور ہوا، جو سب مسلمانوں کو شامل ہے، مصنف نے ایمان کی حدیث مقدم کی، اس واسطے کہ ایمان سب نیکیوں اور عبادت کی جڑ ہے، بدون ایمان کے کوئی عبادت اور نیکی درست نہیں" (ص ۷، ۸)

حدیث مشارق الانوار اس کا ترجمہ اور یہ فائدہ ان تینوں پر ایک مرتبہ اور نظر ڈالئے محشی نے حدیث مافی الباب کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو کس خوبصورتی کے ساتھ جوڑ دیا ہے، اس پر فائدہ سونے پر سہاگہ ہے،

افسوس ہے کہ ہندوستانی شارحین و مفسرین کی محنتوں کا اندازہ خود ہم بھی نہیں کر سکتے، تو جن لوگوں تک اس زبان یا اس ملک کی مذہبی و قومی کتابیں نہیں پہنچ سکتیں ان کا کیا گلہ، مشارق پر یہ فوائد علم حدیث کی بے نظیر شرح ہے، شارح ناقل نہیں، صاحب بصیرت ہے، جس طرح ترجمہ تحفۃ الاخیار میں شرح کو سمو دیا ہے، اسی طرح شرح میں احادیث متذکرۂ فی الباب کے ساتھ ان ٹکڑوں کو جوڑ دیا ہے جو ایک دوسرے سے علحدہ ہونے کی وجہ سے بکھرے پڑے تھے،

لیکن افسوس ہے کہ ہندوستانی طالب علم حدیث (محققین) اب تک مولانا خرم علی کے ان فوائد کو کوئی مقام نہ دیسکے، پس ان فوائد ترجمہ تحفۃ الاخیار پر راقم الحروف نے الفوائد علی مشارق الانوار

کا عنوان مقرر کیا!

سرم خوش است وبیانگ بلندی می گویم
کہ من نسیم حیات از پیالہ می جویم

اگر سطور الفوائد (علی مشارق الانوار) کا شمار کیا جائے، تو یہ متن و ترجمہ دونوں سے اَضعافاً مُضعافاً ہین،

(۳۰) تبصرۃ الابصار فی تخریج الآثار ملقب بنام تاریخی شوارق المشارق از مولوی الٰہی بخش خان مرحوم بڑاکری بہاری (م ۱۳۳۴ھ / ۱۹۱۵ء)

یہ مشارق الانوار کی ترتیب فقہی ہے، طابع (مشارق -) مولوی محمد عبد الرحمان بن حاجی محمد روشن خان فرماتے ہین :-

"مصنف مغفور نے ترتیب احادیث اس مشارق الانوار کی الفاظ صدر پہ رکھی، تا ناظرین کو حدیثون کے یاد کرنے مین آسانی ہو، مگر بہ ترتیب فقہی جس حکم کی حدیث مطلوب ہو، نکالنا اس کا دشوار تھا، لہٰذا اس امیدوار رحمتِ منان محمد عبد الرحمان بن حاجی محمد روشن خان غفر لہما کے ذہن مین آیا، کہ اب کی بار کوئی ایسی نئی ترکیب ایجاد کیجئے، کہ یہ دشواری آسان ہو جائے اور حسب ترتیب فقہ ہر حدیث مطلوب نکل آئے، کہ یہ بڑے فائدے کی بات ہے"

"پس جناب مخدومی مولوی الٰہی بخش صاحب عم فیضہم سے اس امر مین استصواب چاہا تو انھون نے کہ خصوص ایسے امور مشکلہ کے حل مین ذہن عالی و فکر بلند سے ایجاد جدید نہایت مفید فرماتے ہین، میرے اصرار پر اس جدول کو ۱۲۷۹ھ / ۱۸۶۲ء مین لکھنا شروع کیا"

اس نسخہ مین یہ جدول شائع ہوئی ہے جس کی وجہ سے بڑی مشکلین آسان ہو گئی ہین،

مولانا ابو طاہر بہاری م ۱۳۴۵ھ / ۱۹۲۶ء مرتب تبصرۃ الابصار ہندوستان کے علماے فحول مین سے تھے،

مولانا الٰہی بخش خان کا ذکر انھون نے اپنی کتاب مین تفصیل سے کیا ہے فرماتے ہین :-

"آپ علوم عقلیہ و نقلیہ کے جامع تھے، جس فن و علم کو بیان فرماتے، معلوم ہوتا کہ خاص اسی فن کے ماہر و مجرد ہین، کتابین اس قدر یاد تھیں، کہ طلبہ کو مقاماتِ مشکلہ بلا مطالعہ ایسا حل کرکے بتلاتے کہ آسان تر معلوم ہوتا، نہایت حلیم، خلیق و کم سخن اور متواضع تھے، اپنے دشمنون سے بھی خندہ پیشانی سے پیش آتے، اور اچھا سلوک کرتے،

"آپ نے ابتدائی درسیات مولانا علیم الدین صاحب نگرنہسوی متوفی ۳۰ محرم ۱۳۰۶ھ / ۱۸۸۸ء سے پڑھین اور بقیہ درسیات مولانا سید نذیر حسین صاحب دہلوی محدث رحمۃ اللہ علیہ م ۱۳۲۰ھ / ۱۹۰۲ء سے پڑھکر سند و اجازت حاصل فرمائی، بعد فراغ ایک شخص کی طلبی پر حضرت نے آپ کو سنبھل پور رائے پور (دکن) بھیج دیا، اور فرمایا، کہ لائق و فائق مدرس کو آپ کے پاس روانہ کرتا ہون، ایک عرصہ تک رہے، جب مکان تشریف لائے تو بہتیرے حضرات اس دور کی مسافت سے مانع آئے، اور مدرسہ اہلِ حدیث دانا پور ضلع پٹنہ مین مدرس ہوئے، چار سال بعد پھر سنبھل پور سے باصرار طلبی ہونے پر مجبوراً تشریف لے گئے، بعد واپسی سید شاہ مظہر حسین صاحب رئیس بہار کے لڑکے کی تعلیم کے واسطے رہے،"

"علم اصول و حدیث مین خاص مہارت تھی، ما تحت احادیث تفریعات فقہیہ و تطبیق و توفیق کے ساتھ پڑھانا معمول تھا، نہایت محققانہ کلام ہوتا، مقلدانہ تقریر سے سخت نفرت تھی، حق گو ایسے تھے کہ مسائلِ دینیہ مین کسی کا لحاظ نہ فرماتے، اور جو بات آپ کے نزدیک حق و ثابت ہوتی، بیان فرما دیتے، کبھی لومۃ لائم کا خیال دل مین نہ لاتے،"

اہل بہار کو آپ کی ذات سے بہت فیض پہنچا، اشاعت سنت و تردید بدعت ہمیشہ شغل رہا، کامل صحاح ستہ بیس مرتبہ سے زیادہ مرتبہ پڑھائی، ادب مین یہ کمال حاصل تھا کہ برجستہ

عربی مین نظم ونثر فرماتے، اور مسودہ مین محو واثبات نہ ہوتا، جیسا کہ المکاتیب سے ظاہر ہے"

"آپ کے تلامذہ سے مولوی مولابخش خان صاحب براکری (آپ کے برادر حقیقی م ۱۳۴۸ھ / ۱۹۲۹ء) مولوی عبدالمجید خان صاحب رئیس گلنی (بہاری) مولوی شیخ محمد ابراہیم بن حاجی شیخ مرحوم داناپوری، مولوی محمد سعید خان صاحب داناپوری، مولوی ابوالحسنات عبدالغفور صاحب داناپوری، خاکسار ابوطاہر بہاری، مولوی عبدالواحد خان صاحب الحیررام پوری ہین"

آپ کی تالیفات نافعہ سے شرح قصیدہ فرزدق تمیمی، شرح حدیث[۵] ام ذرعہ، شرق القمرین[۶] لہدایۃ الزوجین، سعادۃ الدارین فی اطاعۃ الوالدین، زجر العاصی عن قرب المعاصی، شریعت کا درہ، نجات[۷] المومنین فی حفظ الاربعین، سوط الرحمٰن وغیرہ (۲۰) سے زائد رسائل ہین جن مین سے اکثر مختلف مطابع مین بوجہ کمال مفید ہونے کے مکرر طبع ہو چکے ہین تبصرۃ الابصار فی تخریج الآثار مشتمل بر تبویب مشارق الانوار: ابو یحییٰ، ۱۳۳۴ھ مین ... نماز صبح کے وقت بہ حالت سجدہ بہار ضلع پٹنہ مین انتقال فرمایا، تاریخ وفات مولوی الٰہی بخش مرحوم[۸] (۱۳۳۴ھ / ۱۹۱۵ء)

ممدوح نے مولانا ولایت علی مرحوم (م ۱۲۶۹ھ / ۱۸۵۲ء) صادق پوری کے بعض فارسی رسالون کا اردو ترجمہ کیا، میان صاحب سے استفادہ کے زمانہ مین صاحب عون المعبود، علامہ ابو الطیب شمس الحق ڈیانوی (م ۱۳۲۹ھ / ۱۹۱۱ء) مولانا رحیم آبادی (عبدالعزیز م ۱۳۳۶ھ / ۱۹۱۷ء) ان کے ہم سبق تھے، صاحب ترجمہ کے حقیقی بھائی مولوی مولابخش خان (م ۱۳۴۸ھ / ۱۹۲۹ء) بھی صاحب علم وسند اور میان صاحب سے مستفیض تھے، اولاد میں دو

---

[۵] و [۶] لیکن یہ دونون نام ایک ہی کتاب کے ہین، جو مطبع احمدی لاہور ۱۳۳۴ھ مین چھپی ہے ضخامت ص ۳۹ (دیدہ مولف) [۷] اربعین حدیث پر ہے، پورا نام ہدایۃ المسلمین بشرح نجاۃ المومنین فی حفظ الاربعین ہے مطبوعہ نولکشور پرنٹنگ ورکس پریس لاہور، ۱۳۲۰ھ ہجری صفحات ۲۸، مترجمہ بہ اردو، تمام احادیث اتباع سنت ومذمت بدعت پر ہین۔ [۸] اخبار اہلحدیث ج ۱۶ نمبر ۴۶۔

صاحبزادون کا علم ہے (۱) یعقوب حسن خان صاحب جن کے لئے زجر العاصی لکھی (۲) اور یوسف حسن خان فارسی شاعری میں دخل تھا، کتاب الدرر المنثور فی تراجم اہل صادق پور مین ان کی ایک نظم چھپی ہے،

(۳۱) مشکوٰۃ الانوار لتسہیل مشارق الانوار: مولوی عبدالغفور غزنوی امرتسری (م ۱۳۵۴ھ / ۱۹۳۵ء) (اردو) مطبوعہ مطبع الفاروقی دہلی،

اس میں مشارق الانوار کی تبویب وترتیب علی نہج المشکوٰۃ ہے، مولانا غزنوی موصوف نے تمام مشارق کو کتابتہ بھی فہرست مدونہ کے مطابق بدل دیا ہے، البتہ نمبرون مین تبدیلی نہیں کی، مثلاً سب پہلی حدیث (تسہیل) مین الاعمال بالنیات لائے ہین، مگر یہ نمبر اصل نسخہ کا نمبر ۱۲۵ ہے، الغرض مولوی عبدالغفور کا مقصد صرف ترتیب علی نہج المشکوٰۃ المصابیح ہے، جیسا کہ فرماتے ہین:-

"لہذا اس امیدوار رحمت رحمان ابوادریس عبدالغفور بن محمد بن عبداللہ الغزنوی غفر اللہ لہم کو نہایت مناسب بلکہ واجب معلوم ہوا، کہ اس کتاب کو ترتیب معنوی پر بنالیا جاوے، تاکہ سب مسلمان بھائی اس سے بآسانی تمام فائدہ اٹھا سکین، اور جس حکم کی احادیث مطلوب ہون، بآسانی نکال سکیں، چنانچہ مشکوٰۃ وغیرہ مین تو مین نے اپنے چچا مولوی عبداللہ (م ۱۳۰۰ھ / ۱۸۸۲ء) بن عبداللہ الغزنوی (م ۱۲۹۸ھ / ۱۸۸۰ء) رحمہما اللہ تعالیٰ سے اس بارہ مین مشورہ کیا، تو انھون نے اس بات کو بہت پسند کیا، اور ان کو اللہ تعالیٰ نے ذہن عالی اور فکر بلند دیا تھا، جس کی صفت مین بیان نہین کرسکتا ہون، اور آپ نے مجھ کو یہ ترکیب سکھلائی، کہ اس کے ابواب موافق مشکوٰۃ کے ہونے چاہئین، اور ہر باب مین تین فصلیں ہون، فصل اول مین بخاری اور مسلم دونون کی حدیثین ہون، اور دوسری فصل مین حدیث بخاری کی، اور تیسری فصل مین فقط مسلم کی حدیثین ہون، اور جس باب مین تینون مین سے کوئی فصل نہ ہو، اس مین اس طرح رکھنا چاہیے، کہ اس باب مین فلان

فصل نہیں، چنانچہ مشکوٰۃ والے کا بھی یہی قاعدہ ہے، تو جیسا آپ نے ارشاد کیا، اوسی کے مطابق مین نے یہ کتاب بنائی، تو گویا یہ کتاب ایک چھوٹی مشکوٰۃ بن گئی ہے، بلکہ مشکوٰۃ پر بھی فوقیت لے گئی، اس واسطے کہ یہ کتاب مختصر ہے اور اس کی تمام حدیثون کی صحت پر اتفاق ہے، اس مین کوئی حدیث ایسی نہین، جو غیر معتبر ہو، بخلاف مشکوٰۃ کے کہ اس مین ہر قسم کی حدیثین مذکور ہین، صحیح بھی اور ضعیف بھی ..... ۱۳۰۷ھ/۱۸۹۰ء مین حسب دلخواہ یہ کتاب تمام ہوئی، اور مشکوٰۃ الانوار تسہیل مشارق الانوار اس کا نام مقرر کیا"، (ص ۶۳۳، ۶۳۴)

اس مین بعض حواشی بھی ہین، مگر شاذ، ترجمہ، و فوائد مولانا خرم علی بلہوری (م ۱۲۶۰ھ/۱۸۴۴ء) کے ترجمہ جس کا ذکر شرح نمبر ۲۹ پر کیا گیا ہے،

صاحب مرتب ہندوستان کے مشہور عارف باللہ عبد اللہ صاحب غزنوی امرتسری (م ۱۲۹۸ھ/۱۸۸۱ء) کے پوتے اور صلحاے اُمت سے ہین، امرتسر مین ترویج کتاب وسُنت کے لئے مطبع انوار الاسلام قائم فرمایا، مشکوٰۃ المصابیح مترجم ومحشی اور قرآن مجید مترجم ومحشی چھپوائے، الروض الریاحین ترجمہ ریاض الصالحین مولوی احمد الدین ساکن کوم ضلع لودھیانہ (م ۔۔۔) اسی مطبع مین چھپا ہے، امام ابن تیمیہ اور حافظ ابن القیم کے چند رسائل اسباب النزول و جلاء الافہام وغیرہ طبع کرائے، اور شیخین کی تصانیف سے اسی خاندان نے علماے ہند کو متعارف کیا، یہ نکتہ سب سے پہلے صاحب الہلال مولانا ابو الکلام نے بیان فرمایا، کوئی کتاب اس مطبع مین نہ چھپی، جس کی غرض محض تجارت ہو، بلکہ صرف وہ کتابین چھپوائین، جن کا مقصد اشاعت کتاب وسُنت تھا، مولوی عبد الغفور غزنوی ذیقعدہ ۱۳۵۶ھ/۱۹۳۵ء مین بعمر ۶۵ سال انتقال فرمایا،[۵۱]

امام حسن صغانی کی دوسری تالیفات | امام حسن کی تصانیف مین موضوعات کا ذکر اوپر گذرا ہے، ا...

---

[۵۰] ایک فروگذاشت کا ذکر ضروری ہے، مشارق الانوار کی ایک اور اردو شرح کا تذکرہ نظر سے گذرا، یہ غالباً مولانا محمود حسن نانوتوی کی ہے، مگر شرف مطالعہ کا اتفاق نہ ہوسکا،

ان کے دو رسالے ہین، یہ دونون رسالے کتب خانہ خدیویہ مصر مین (قلمی) موجود ہین،[۵۱] اور طبع بھی ہو چکے ہین،[۵۲] مولانا عبد الحی لکھنوی نے ان کا تذکرہ الفوائد البہیہ مین کیا ہے، جس میں ان دونون رسالون کا ذکر آیا ہے،[۵۳]

۳- الدر الملتقط فی تبیین الغلط و نفی اللغط، یہ رسالہ موضوعات (نمبر ۱ و ۲) سے علٰحدہ معلوم ہوتا ہے کہ "دروے موضوعات کتاب الشبہات والنجم جمع نمودہ"[۵۴] نیز فہرست کتب خانہ خدیویہ مصر مین بھی الدر الملتقط کا اندراج باب کتب موضوعات سے علٰحدہ کیا گیا ہے،[۵۵]

۴- کشف الحجاب عن احادیث الشہاب اور یہ الدر الملتقط (نمبر ۳) سے علٰحدہ ہے،

۵- شرح صحیح بخاری (سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان ۲۰)

۶- الشمس المنیرہ من الصحاح الماثورۃ (" " ")

۷- زبدۃ المناسک، (اتحاف النبلا، ۲۴۳)

۸- در السحابہ فی وفیات الصحابہ (فن رجال) (سبحۃ المرجان ص ۳۰)

۹- شرح در السحابۃ (" ") (" ")

۱۰- مجمع البحرین، یہ بارہ جلدون مین ہے،

۱۱- التکملہ (علی الصحاح) صحاح مین جو کمی رہ گئی تھی، اس کو اس میں پورا کیا گیا ہے،[۵۶]

اسی طرح فنِ لغت مین ذیل کے چند اور رسالے ہین،

---

[۵۱] فہرس دار الکتب العربیہ الموجودۃ فی الدار لغایت ۱۹۲۱ مخطوط ۲،۶، مجامیع ص ۹۰ و مخطوط ۹ [۵۲] فہرس تجارتی ابناے محمد بن غلام رسول بمبئی [۵۳] الفوائد البہیۃ ص ۳۰ [۵۴] اتحاف النبلا ص ۸ [۵۵] فہرس دار الکتب العربیہ الموجودۃ فی الدار لغایت ۱۹۲۱،

[۵۶] البلغۃ فی اصول اللغۃ للنواب (نقلاً عنہ و ترجمۃً منہ) ص ۹۹ و ۸۸،

(۱۲) اسماء الاسد (۱۳) اسماء الذئب (۱۴) الاضداد[۱] (۱۵) الشوارد (۱۶) کتاب الافتعال،

متفرق کتابیں :-

(۱۷) الفرائض[۲] (۱۸) العروض[۳] (۱۹) درجات العلم والعلماء[۴] (۲۰) کتاب المفعول[۵] (۲۱) شرح ابیات المفصل[۶] (۲۲) بغیۃ الصدیان (۲۳) العباب الزاخر واللباب الفاخر،

"وصنف کتاب العباب فی اللغۃ فاخترمتہ، المنیۃ قبل ان یکمل بثلاث احرف ببغداد فی شہور خمسین سمائۃ" (سبحۃ المرجان ص ۲۸)

علامہ بلگرامی فرماتے ہیں کہ العباب سپرد قلم فرما رہے تھے، ہنوز تیسرا حرف بھی مکمل نہ ہوا تھا کہ

کوس رحلت بکوفت دست اجل

بغداد میں مقیم تھے، اور وہیں پیک اجل آپہنچا، رحمہ اللہ تعالیٰ،

---

۱ سبحۃ المرجان ص ۸۳ ۲ ایضاً ۳ اتحاف النبلاء ص ۲۴۳ ۴ کشف الظنون ج ۲ ۵ مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۷۰، ۶ سبحۃ المرجان ص ۲۸،

گل رعنا

اردو زبان کی ابتدائی تاریخ، اور اس کی شاعری کا آغاز، اور عہد بعہد کے اردو شعراء کے صحیح حالات اور ان کے منتخب اشعار، اردو میں شعراء کا یہ پہلا مکمل تذکرہ ہے جس میں آب حیات کی غلطیوں کا ازالہ کیا گیا ہے، دلی سے لے کر حالی تک کے حالات،

قیمت :- عیر، ضخامت :- ۵۴۰، صفحے،

"منیجر"

استفسار وجواب

اسلام میں مجلس شوریٰ کا نظام

مولوی ابوالقاسم صاحب
قصبہ بجری آباد ضلع غازیپور (یوپی)

"کیا اسلام میں مجلس شوریٰ کا کوئی نظام بنایا گیا ہے، اور اگر کسی مسئلہ میں کتاب و سنت کی کوئی واضح ہدایت موجود ہو اور ارکان مجلس اور امام یا خلیفہ وقت میں دیانتداری سے اختلاف رائے ہو جائے تو کیا اسلام کے رو سے امام کو اختیار حاصل ہے کہ وہ جمہور کی رائے کو نظرانداز کرکے اپنی ذاتی بصیرت اور رائے کے مطابق فیصلہ کر دے، اگر اس کو یہ حق حاصل ہو تو دلائل شرعیہ سے اس کو واضح کیا جائے"[۱]

معارف :- گرامی نامہ ملا، یاد فرمائی کا شکریہ، اس سے پہلے بھی آپ کے مکتوب ملتے گئے مگر افسوس ہے کہ جواب دینے سے قاصر رہا، اصل یہ ہے کہ اس استفسار کے جواب میں لب کشائی سے گریز کرنا ہی مناسب معلوم ہوتا تھا، یہ زمانہ فتنہ کا ہے، مسلمانوں کی اکثریت کی بنیاد پر جو حکومتیں قائم ہیں، ان کو صحیح اسلامی حکومت سے موسوم کئے جانے کا جذبہ بڑھ رہا ہے، اس لئے خطرہ گذرتا ہے کہ کہیں خلیفہ کے اختیارات اور مجلس شوریٰ سے اس کے تعلق پر قیاس کرکے آمرانہ نظام حکومت کے لئے ثبوت نہ بہم پہنچائے جائیں، اور یہ مباحث جب نگاہوں کے سامنے آئیں تو ان کی اصل روح کو چھوڑ کر غلط انداز سے عوام کی ذہنی تربیت کی راہ نہ نکالی جائے، اس لئے موجودہ دور میں ایسے

---

۱ افسوس ہے کہ جناب مستفسر کا وہ مکتوب گرامی جو استفسار کے سلسلہ میں آیا تھا، اور جس کے جواب میں یہ سطریں لکھی گئیں کاغذوں میں دب کر کہیں رہ گیا، اس لئے استفسار کے مفہوم کا متن بھی ہمیں خود لکھنا پڑا ہے، "س"

مسائل جہان تک نگاہون سے اوجھل رہیں، زیادہ مفید ہے لیکن آپکے بار بار کے اصرار سے اس سلسلہ مین چند اشارات ذیل مین پیش ہین، لیکن یہ خیال شریف مین رہے کہ ان مین سے کوئی بات بھی اپنی دوسری باتون سے علحدہ ہوکر صحیح نہین رہ سکتی، یہ مسئلہ ذیل کی چند تصریحات سے واضح ہوسکتا ہے :-

(الف) یہ صحیح ہے کہ اسلام مین مسائل کے فیصلہ کا معیار عمومیت کے ساتھ محض تعداد کی اکثریت محض پر مبنی نہین، اس لئے کسی مسئلہ کا فیصلہ محض تعداد کی قلت وکثرت کی بنا پر نہیں کیا جاسکتا، بلکہ اسلام مین اس کا اصل معیار اس مسئلہ کا کتاب وسنت اور حق کے مطابق ہونا ہے، اور یہی ہر مسئلہ کے فیصلہ کی اصل میزان ہے،

(ب) دوسری طرف اسلام میں خلیفہ وامام کے لئے ضروری ہے کہ ایسے تمام مسائل مین جن میں قرآن مجید کی کوئی نص یا حدیث کی کوئی صریح روایت یا اجماع امت سے کوئی پچھلا متفقہ فیصلہ موجود نہ ہو، تو وہ مجلسِ شوریٰ طلب کرکے اس سے ہدایت حاصل کرے، پھر یہی راہِ عمل ان تمام وقتی وسیاسی مسائل کے لئے ہے، جو مصالح امت کے لحاظ سے ضروری ہون، خواہ وہ عام سیاسی امور ہون، یا کوئی وقتی جنگی صورتِ حال، ان مین سے کسی صورت مین خلیفہ وامام کے لئے مناسب نہین کہ وہ محض اپنی ذاتی راے پر اعتماد کرکے کوئی قدم اُٹھائے، اللہ تعالیٰ نے مسلمانون کی یہ صفت بیان فرمائی ہے،

وامرھم شوریٰ بینھم (آل عمران) اور اُن کے کام آپس کے مشورہ سے ہوتے ہین،

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے ارشاد فرمایا گیا،

وشاورھم فی الامر فاذا عزمت فتوکل علی اللہ (آل عمران) اور کام مین اُن سے مشورہ لین پھر جب تو قصد کرچکا تو اللہ پر بھروسہ کر،

یعنی باہمی مشورہ کے بعد جو راے بہتر قرار پائے، اس پر ہمت وعزیمت کے ساتھ عمل کیا جائے،

(ج) لیکن اسلام نے مجلسِ شوریٰ کے لئے کوئی متعین نظام مقرر نہین کیا ہے، بلکہ اس مین امت

کے لئے زمان ومکان کے لحاظ سے آزادی دی گئی ہو کہ ارباب حل وعقد اس کے لئے خود کوئی وسیلہ اختیار کرلین اسی لئے خلافتِ راشدہ کے زمانہ مین مختلف موقعون کے لحاظ سے مختلف صورتین اختیار کی گئین، عمل کی یہ آزادی ہمین آج بھی حاصل ہوسکتی ہے، کہ اپنے مصالح کے لحاظ سے خود کوئی نظام اور قاعدہ بنالین، جو کتاب وسنت اور سلف کے طریق کی روشنی اور اسی روح کے مطابق ہو جس پر اسلام کے صدر اول مین عمل درآمد جاری رہا،

(۱) مجلسِ شوری کے متعلق مذکورۂ بالا تینون امور بنیاد واساس کا درجہ رکھتے ہین، ان مین سے پہلی بات یہ کہ اسلام مین مسائل کے فیصلہ کا معیار تعداد کی کثرت وقلت نہین، بہ ظاہر موجودہ زمانہ مین عام جمہوری اصول کے خلاف معلوم ہوتی ہے، مگر یہ محض بادی النظر مین سمجھا جاسکتا ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ جب اصل معیار کسی مسئلہ کا کتاب وسنت اور حق کے مطابق ہونا ہے، تو یہ سمجھا جاسکتا ہے، کہ اسلامی نظام مین جو مجلسِ شوریٰ ہوگی اس کے ارکان کے ذہن دین کے سانچے مین ڈھلے ہون گے، ان کی دینداری سے ایسی توقع ممکن نہین ہے کہ وہ کسی مسئلہ کو دین کی روح کے مخالف جانتے ہوئے اس کے منظور کئے جانے پر اصرار کرین کہ امت کے اکابر کبھی کسی باطل پر متفق ہو ہی نہیں سکتے، دوسری طرف اگر کوئی خلیفہ جان بوجھ کر کتاب وسنت کے خلاف راہ اختیار کرے گا، تو کھلی ہوئی بات ہے، کہ اس مین اس کی پیروی نہ کیجائے گی، کہ "انما الطاعة فی المعروف" اور "لا طاعة لمخلوق فی معصیة الخالق" اسلام کے جانے بوجھے اصول ہین، حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی حکومت، اس کے ارکان کے اطوار، اخلاق اور طرزِ سیاست کا اندازہ موجودہ حکومتون کے نظام اور اُن کے معیار سے لگایا ہی نہین جاسکتا،

(۲) اسلام مین مجلسِ شوریٰ کو مسلمانون کی سیاسی واجتماعی زندگی مین نمایاں درجہ حاصل رہا ہے، چنانچہ اسلام کے صدر اول مین مذکورۂ بالا دونون آیاتِ کریمہ کی روشنی مین ملکی وغیر ملکی معاملات کے لئے باہمی مشاورت اسلامی حکومت کے لئے ایک بنیادی شرط رہی، اور اس پر عمل درآمد جاری رہا، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایسے مسائل مین جن مین وحی والہام سے کوئی راہ بتائی نہ گئی ہوتی، آپ اربابِ صلاح سے

مشورہ فرماتے تھے، اور بعض مثالین ایسی بھی ہین کہ آپ کی راے گرامی سے کسی اور صحابی کی راے موا
ہوئی تو آپ نے اس کے موافق عمل فرمایا، چنانچہ بدر کے قیدیون کا جب معاملہ آیا، تو آپ نے حضرت ابوبکر
و حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما سے مشورہ فرمایا، حضرت صدیق اکبرؓ کی راے آپ کی راے گرامی سے مو
ہوئی، اور آپنے اسی کے مطابق فیصلہ فرما دیا،

ارباب علم کا خیال ہے کہ آپنے اس موقع پر صرف دو صحابیون سے اس لئے مشورہ فرمایا کہ اس و
وشاورہم فی الامر کا حکم ربانی نازل نہین ہوا تھا، یہ آیت پاک غزوۂ احد مین نازل ہوئی، جب آپ
آیت مین عزم کا جو ذکر آیا ہے، اس کی تصریح پوچھی گئی، تو آپنے ارشاد فرمایا "مشاورۃ اہل الرآے ثم اتباعہ
یعنی ارباب راے سے مشورہ کرنا پھر اس کا اتباع کرنا، یہ ظاہر ہے کہ یہ مشورہ" امت کے تمام افراد
بیک وقت ممکن نہین، اس لئے اس مشورہ کے اہل، وہ ارباب حل وعقد ہون گے، جن پر امت ا
کو کامل اعتماد ہوگا، اور وہ اپنی دیانت، تقوی اور اصابت راے سے اس کے اہل سمجھے جائین گے، گو
دوسرے لفظون مین انھین عوام مسلمین کا اعتماد و نمایندگی حاصل ہو گی،

پھر یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ جب مجلس شوریٰ مین ارباب حل وعقد جمع ہون گے، اور وہ اپنی د
بصیرت سے کسی مسئلہ مین کوئی فیصلہ کرین گے، تو ان کی تعدادی اکثریت ناقابل لحاظ بھی نہیں رہ سکتی، ا
امام یا خلیفہ کی واحد یا اقلیت رکھنے والی جماعت کی رایون کے برخلاف صاحب صلاحیت افراد کی
کی جس طرف کثرت ہوگی، وہ زیادہ قرین صحت و صواب سمجھی جائے گی، لیکن یہ خیال رہے کہ اس اقلیت
اکثریت مین تعداد محض کے علاوہ مجلس شوریٰ کے ارکان کے اوصاف و محامد کا لحاظ بھی رکھنا پڑے گا
اس سلسلہ مین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد گرامی سے حقیقت زیادہ واضح ہو سکتی ہے،

ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت فرمایا، کہ یا رسول اللہ
اگر فیصلہ کرنے مین کوئی ایسا مسئلہ آجائے جس کے متعلق کوئی وحی نہ آئی ہو، اور نہ سنت رسول کا علم ہو، تو

ایسی صورت مین آپ کیا ارشاد فرماتے ہین، اس کے جواب مین آپنے فرمایا،

تجعلونہ شوریٰ بین اہل الفقہ
والعابدین من المومنین و
لا تقض فیہ برایک خاصۃ
(طبرانی فی الاوسط)

اس مسئلہ کو ارباب فقہ، اور عبادت گذار
مسلمانون کے سامنے پیش کرو، اس مین خاص
اپنی راے سے کوئی فیصلہ نہ کرو،

ایک دوسری حدیث مین حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے ارشاد ہوا،

واستشر فی امرک الذین یخافون
اللہ عز وجل، (مستدرک و بیہقی)

اور اپنے کام مین ان سے مشورہ چاہو جو اللہ
تعالیٰ سے ڈرتے ہین،

اور اللہ سے ڈرنے والے جیسا کہ قرآن مجید مین ہے وہی ہین جن کو علم و معرفت حاصل ہے، انما یخشی اللہ
من عبادہ العلماء (الآیہ) اللہ سے علماء ہی ڈرتے ہین، لفظ علما یہان اصطلاحی معنون مین نہین ہے
بلکہ مراد اہل علم سے ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی مجلسون مین اجتماعون مین بلکہ نماز کی جماعتون مین بھی اس بات کا
لحاظ فرماتے تھے، کہ اہل عقل و فہم آپ کے قریب تر رہین، تاکہ وہ بات کو سمجھ سکین، اولو الاحلام والنہی
کے الفاظ اس موقع پر احادیث مین آئے ہین،

قرآن مجید مین اولو الامر کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے،

اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول و
اولی الامر منکم

اللہ کی اطاعت کرو، اور اللہ کے رسول اور
اولو الامر کی اطاعت کرو،

اس اولو الامر کی تشریح دوسری آیت مین یہ ہے،

واذا جاءھم امر من الامن او
الخوف اذاعوا بہ ولو ردوہ

اور جب ان کے پاس امن و خوف کی کوئی
خبر آتی ہے، تو اس کو پھیلا دیتے ہین، اور اگر

اِلَی الرَّسُوْلِ وَاِلٰی اُولِی الْاَمْرِ مِنْھُمْ لَعَلِمَہُ الَّذِیْنَ یَسْتَنْبِطُوْنَہٗ مِنْھُمْ ۔ (نساء - ۱۱)

اوس کو رسول اور اپنے مین سے اولو الامر تک ..... پہنچا دین تو اس کی تحقیق وہ کر لیتے جو بات کا پتہ لگا سکتے ہین،

اس سے معلوم ہوا کہ اولو الامر جو حقائق و مسائل کا استنباط کرین اون کی بھی اطاعت مصالح اسلامیہ مین کی جائے،

اس لئے جو صورت آپ نے لکھی ہے، اس مین امام کے لئے ضروری ہوگا، کہ پہلے وہ اپنے شرحِ صدر کو اربابِ حل و عقد کے سامنے رکھے، انھیں اپنا ہمنوا بنائے، اگر اس مین اس کو کامیابی نہ ہو اور لوگ اپنی دینی بصیرت و معاملہ فہمی سے اپنی اس رائے پر جمے رہین، جو اگرچہ امام کی رائے سے مختلف ہے مگر وہ باہم متفق یا بیشتر افراد ہمنوا ہین، تو پھر امام کے لئے مناسب ہوگا، کہ وہ اپنی رائے کو ان کی رایون کے تابع کر دے اور اس کی مثالین عہدِ رسالت و خلافتِ راشدہ کے دورون مین بھی گذر چکی ہین،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے جہان تک امورِ دینیہ کا تعلق تھا، آپ کو صلاح و مشورہ کی حاجت نہ تھی، کہ آپ کا سرچشمۂ علم، وحی ربانی و ملکۂ نبوت تھا، البتہ دنیاوی امور مین جن مین جنگی و سیاسی مصالح و ضروریات بھی داخل تھے، آپ صحابۂ کرام سے صلاح و مشورہ فرماتے، اور جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، کبھی ایسا بھی پیش آیا کہ آپ نے اپنی رائے کے مطابق عمل کو ترک کرکے دوسرون کے مشورہ پر عمل فرمایا، جیسا کہ بدر کے موقع پر جب آپ نے ایک مقام پر قیام فرمانا چاہا، اور وہاں اُتر پڑے، تو حضرت حباب بن منذر بن جموح رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا، کہ "یا رسول اللہ! اس مقام کو وحی کے مطابق اختیار فرمایا ہے، تو اس سے ہم آگے پیچھے نہین ہٹ سکتے، یا حضرت نے اپنی رائے سے اس کو منتخب فرمایا ہے، اور لڑائی مین جنگی چالین ہوتی ہین"، آپ نے فرمایا کہ نہین محض ذاتی رائے، اور جنگی چال ہی کے طور پر ہے" تو پھر حضرت حباب نے ایک دوسرے مقام کے لئے مشورہ دیا، اور آپ نے اپنی رائے کو ترک کرکے اس کو قبول فرمالیا،

اگرچہ اس موقع پر یہ نہین کہا جا سکتا کہ حضرت حبابؓ سے گفتگو کے بعد بھی آپ کی پچھلی رائے اپنی جگہ قائم رہی، اور اس کے باوجود آپ نے اس کو ترک کرکے ان کی رائے قبول کر لی، بلکہ زیادہ امکان یہ ہے کہ اس گفتگو کے بعد خود آپ کی رائے بھی تبدیل ہو گئی، مگر تاہم اس موقع پر ہمارے لئے وہ ارشادِ گرامی راہنما ہے جو آپ نے حضرت علیؓ سے فرمایا، کہ ولا تقض فیہ برای خاصۃ اور اس لئے دورِ حاضر مین امام و خلیفہ کے لئے یہی کہا جا سکتا ہے، کہ اوس کو اپنی رائے ترک کرکے عام ازین کہ وہ ذاتی طور پر متفق ہو یا نہ ہو، اربابِ حل و عقد کی کثرتِ رائے کا اتباع کرنا مناسب ہے،

(۳) باقی رہا اسلام مین شوریٰ کے نظام کے متعلق کسی متعین طریق کا مقرر نہ ہونا، تو دراصل اس مین اُمت کی فلاح و بہبودی کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے، تاکہ اس مین وسعت باقی رہے، اور اُمت کے مختلف حالات و مقتضیات کے لحاظ سے نظام مین رد و بدل کی آسانی برقرار رہے، کیونکہ ایسے جزئی قوانین کا نفاذ ممکن نہ تھا، جن پر ہر زمانہ اور مقام مین یکسان عمل کیا جاتا، اور اگر کوئی خاص نظام متعین کر دیا جاتا تو خطرہ تھا کہ لوگ اس کو دینی حکم سمجھ کر ہر زمانہ مین اسی کو لئے رہتے، اگرچہ اس پر عمل کرنا امت کے مصالح کے خلاف ہوتا، اس لئے یہ محض اصولی بات کہہ دی گئی، کہ "مشاورہ" ایک دینی حکم ہے، اور اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ مین عمل کرنے کی تربیت اُمت کو دی، چنانچہ ہجرت کے وقت سے فتح مکہ تک آپ کا طریقِ عمل یہ رہا، کہ آپ مسجدِ نبویؐ مین اہم مسائل پیش فرماتے، مسلمانون کا سوادِ اعظم وہان موجود ہوتا، جن مین اربابِ حل و عقد بھی ہوتے، اور آپ مسائل پر مشورہ فرما لیتے، پھر جب مسلمانون کی تعداد مین اضافہ ہوا، دور دور کے مختلف مقامات اسلامی سلطنت کے ماتحت آئے، تو مختلف قبائل اور گروہ کے اربابِ حل و عقد پر اعتماد کیا گیا، اور وہ اپنی اصابتِ رائے سے اہم امور کا فیصلہ کرتے رہتے، چنانچہ خلافتِ صدیقی و فاروقی مین متعدد مسائل کا فیصلہ ایسی مجلسون کے انعقاد سے ہوتا رہا، یہانتک کہ زراعت اور مالگذاری یا جنگ کے معاملات مین اہلِ ذمہ اور عام اہلِ تجربہ سے مشورہ کیا گیا ہے،

اس موقع پر تشریح اسلام کی اصطلاح فنی مین دو لفظ خاص طور کے لحاظ سے قابل ہین، ایک اجماع اور دوسرا جمہور، اجماع کے طول طویل مباحث کا خلاصہ اسی قدر ہے کہ اسلام کے اصول کتاب و سُنّت کے تحت مین کسی جزئی مسئلہ کے فیصلہ کے لئے جس کا ذکر نص مین نہ ہو، کسی زمانہ کے علمائے اُمّت کسی ایک پہلو پر تمامتر یا بالاکثریت قولاً یا عملاً متفق ہو جائین،

جمہور کے معنی یہ ہین کہ جس جانب علی العموم اکثر علماء ہون، اس کی نسبت یہ خیال کیا جائے گا، کہ یہ رائے زیادہ صحیح ہے، ایسے ہی موقعوں پر ہمارے فقہاء لکھتے ہین، وعلیہ الجمھور، مختلف مسائل مین صحابۂ کرام اور ائمۂ اعلام کے نام گنا کر کہا جاتا ہے کہ جمہور صحابہ یا جمہور ائمہ یا جمہور اُمّت کی یہ رائے ہے، اور اس کے مقابلہ مین ایک فرد یا قلیل التعداد افراد کی رائے کو شاذ کہا جاتا ہے، جس کے اتباع سے منع فرمایا گیا، احادیث مین جماعت کا ساتھ دینے کا حکم ہے جیسے ید اللہ علی الجماعۃ اور اتبعوا السواد الاعظم اور من شذ عن الجماعۃ وغیرہ احادیث اسی طرف اشارہ کرتی ہین، جامع ترمذی مین اکثر مسائل مین صحابہ و تابعین اور ائمۂ مجتہدین کے نام لے کر کہا گیا ہے، وبہ قال غیر واحد من الصحابۃ او العلماء

مگر یہ جمہوریت اور جماعت عوام افراد کی نہین ہے، بلکہ اہلِ علم و اہلِ عقل کی ہے،

مباحث بالا کا حاصل یہ ہے کہ

۱- ایسے مسائل مین جو منصوص نہیں مشورہ ضروری ہے،

۲- اہلِ شوریٰ اہلِ علم و عقل ہون جن کو اصول سے مسائل کے استنباط کا سلیقہ ہو،

۳- غیر دینی مسائل مین عام اہلِ تجربہ سے بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے،

۴- اگر اہلِ علم و تجربہ کی رائے میں اختلاف ہو تو اکثریت کی رائے کو ترجیح دی جا سکتی ہے،

بہر حال یہ سرسری امور ہین، جو عرض کئے گئے، ضرورت ہے کہ اہلِ علم مجلسِ شوریٰ کے نظام پر غور و فکر کرین، اور کتاب و سُنّت اور آثار و سیر کی روشنی مین اس کے جزئیات کو مرتب و مدوّن کرین، والسّلام

"س"

کیا ناقص مسلمانوں کی نسبت اسلام کی جانب صحیح نہین؟

جناب محمود اکبر خان صاحب
ڈھوک شرفا، کیمل پور، ضلع اٹک

مکرمی محترمی:- سلام مسنون

نومبر ۱۹۴۷ء کے معارف میں استفسار و جواب کے تحت صفحہ ۳۹۵ پر یہ مثال بطور دلیل پیش فرمائی ہے،

"کیا کھٹے آمون کو آپ آم نہیں کہین گے، اور اگر نہین کہین گے، تو کیا آپ اس کو املی بتائین گے، یا یہ کہین گے کہ ہین تو آم ہی مگر کھٹے ہین"[1]

اسلام کی اصطلاحات کو بیان کرنے سے مدعا اگر صرف اسی قدر ہو کہ طرزِ بیان دلپذیر ہو اور معترض کو خاموش کرنے کی کوشش کی جائے، تو آپ کسی حد تک اس مدعا میں کامیاب رہے،

---

[1] حضرت الاستاذ مدظلہ نے افغانستان کے سفرنامہ مین جو "سیر افغانستان" کے نام سے چھپ چکا ہے، عرف عام کے مطابق افغانستان کے لئے "اسلامی حکومت" اور "اسلامی ملک" کے الفاظ استعمال فرمائے ہین، اس پر ایک صاحب عبد العزیز کو ایدی نے اپنی حمیت دینی سے اعتراض کیا تھا کہ "آپ جیسے بزرگون کی تحریرون مین ایسے ممالک کے لئے جو اسلامی ملک اور اسلامی حکومت کا نمونہ نہین ہین، مسلمانون کے ملک اور مسلمانون کی حکومت کے بجائے اسلامی ملک اور اسلامی حکومت کے الفاظ کو دیکھ کر ذہن متشوش ہوتا ہے"، (باقی اگلے صفحہ پر)

کسی حد تک کامل طور پر نہیں"،

لیکن آپ کی پیش کردہ مثال کا اگر تجزیہ کیا جائے تو مثال بھی ویسی ہی بے کار ہے، جیسے کھٹے آم کا باغ لگانا اور پالنا،

اس میں شک نہیں کہ کھٹے آموں کو آم ہی کہیں گے، لیکن جب آم لگانے کے مقصد کو سامنے رکھ کر غور کریں گے، تو اس شخص کا فعل عبث ہی دکھائی دیگا، جو کھٹے آموں کا باغ لگائے، حاشا وکلا اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول عبث کام نہیں کرتے،

جب اس آم میں جو اس وقت نہار ہی آم (غیر مسلم) کے نام سے موسوم ہوتا ہے، اور ملیح آبادی آم (مسلم) میں اعتقاد و عمل کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے، پھر اگر ایسے آموں کو اس کی جانب نسبت دیجائے، تو اس کی بدنامی اور توہین نہ ہوگی؛

فرمائیے اگر آپ کے باغ میں تمام آم کھٹے ہوں تو لوگ آپ کی اس صنعت کی اور انتخاب کی نسبت کیا رائے قائم کریں گے۔

جن لوگوں کے اعتقاد و عمل کافرانہ (مشرکانہ) ہوں، اُن کو ایسے عقائد و اعمال پر مطمئن کرنے کی سعی کرنا اور دنیا جہاں کے بے محل و غلط دلائل تلاش کر کے پیش کرنا صحیح اور درست رویہ ہے؛ اور شرعاً محبوب مشغلہ، اُمید ہے کہ آپ میری اس سیدھی اور صاف بات کو غور سے سمجھنے کی کوشش فرمائینگے،

والسلام، جواب کا طالب۔

(بقیہ حاشیہ ص) قبلہ موصوف نے معترض کے جذبۂ دینی کی قدر کرتے ہوئے اس کا تشفی بخش جواب مرحمت فرمایا تھا، (دیکھو معارف نومبر ۱۹۴۷ء) اور آخر میں بطور تمثیل کے تحریر کیا تھا، کہ کیا آپ کھٹے آموں (ناقص مسلمان) کو آم نہ کہیں گے، اگر آم نہ کہیں گے تو کیا ان کو املی بتائیں گے، یا یہ کہیں گے، کہ ہیں تو آم ہی مگر کھٹے ہیں، معترض نے اسی تمثیل پر اعتراض کیا ہے،

معارف:- حضرت سید صاحب قبلہ بھوپال میں تشریف رکھتے ہیں، اور آپ کا اعتراض کوئی ایسا دقیق اور پیچیدہ نہیں ہے، کہ موصوف کو اس کے جواب کی زحمت دیجائے، آپ کا جذبۂ دینی لائق ستائش لیکن آپ کی برہمی غلط فہمی کا نتیجہ ہے،

آپ نے کھٹے اور میٹھے آموں کی تمثیل سے یہ غلط نتیجہ نکالا ہے، کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ صحیح اور کامل اسلام کے مقابلہ میں ناقص اسلام کی حمایت کیجائے، یا کافرانہ اور مشرکانہ اعمال والوں کی حوصلہ افزائی کیجائے، اگر ایسا ہوتا تو کھٹے اور میٹھے آموں کا فرق ہی کیوں کیا جاتا، تمثیل کا صرف یہ مقصد ہے کہ کامل اسلام اور ناقص اسلام اور کامل مسلمان، اور ناقص مسلمان دونوں کی نسبت اسلام کی جانب صحیح ہے، کیا ناخلف اولاد ابیت کی نسبت سے خارج ہو جاتی ہے، اور آپ کا یہ ارشاد تو سراسر مغالطہ ہے، کہ جب آم لگانے کے مقصد کو سامنے رکھ کر غور کریں گے، تو اس شخص کا فعل عبث دکھائی دے گا، جو کھٹے آموں کا باغ لگائے، حاشا وکلا اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول عبث کام نہیں کرتے"،

معارف میں تو باغ لگانے نہ لگانے کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے، یہ تو تمام تر آپ کی اختراع ہے، اس میں تو صرف کھٹے اور میٹھے آموں کی تمثیل ہے، اس سے کھٹے کا باغ لگانے کی حمایت کہاں سے نکلتی ہے؟ یہ تو آپ کو خود تسلیم ہے کہ شجرِ اسلام کا باغبان خود باری تعالیٰ ہے، اس لئے کسی انسان کے باغ لگانے کا کیا سوال ہو سکتا ہے"،

غالباً یہ آپ کو معلوم ہوگا کہ تمثیل صرف مفہوم کی وضاحت کے لئے ہوتی ہے، اور اس کی تمام جزئیات کا ممثل لہ کے مطابق ہونا ضروری نہیں ہے، پھر کیا میٹھے آم کے تخم سے مختلف اسباب کی بنا پر کبھی کھٹے آم نہیں پیدا ہوتے، یہ تو ہر شخص کا تجربہ ہے کہ اگر اچھے تخم کے درخت کی پوری داشت اور نگرانی نہ کیجائے تو کچھ دنوں کے بعد اس کے پھل کا رنگ اور ذائقہ بدل جاتا ہے،

دنیا کا کوئی نظام بھی خواہ وہ دنیاوی ہو، یا الٰہی مادی ہو یا روحانی و اخلاقی مرورِ زمانہ سے اپنی

اصلی حالت میں قائم نہیں رہتا، اور زمانہ کے ہاتھوں اس میں کچھ نہ کچھ تصرفات ہوجاتے ہیں، جن کی نگرانی اور حفاظت کے لئے محافظین کی ضرورت ہوتی ہے، کہ وہ اوس کو بیرونی اثرات سے پاک، و صاف کرتے رہیں یہی حال اسلام کا بھی ہے، بلاشبہہ اسلام کی ہدایت اور اس کی تعلیمات ابدی ہیں، لیکن خود ان کو اصلی اور صحیح شکل میں قائم رکھنے کے لئے اور اس سے اچھے پھل پیدا کرنے کے لئے مجددین اور مصلحین کی ضرورت ہوتی ہے جس سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا، اور جب اوس فریضہ سے غفلت کیجائے گی، تو اسلام کی تعلیمات مسخ ہوتی رہیں گی، اور اس کی پیداوار مسلمان بھی ناقص پیدا ہوں گے، اس لئے کھٹے اور میٹھے آموں کے درخت لگانے کا کوئی سوال ہی نہیں، بلکہ اگر اسلام کی پوری نگہداشت نہ کیجائے، تو مذکورۂ بالا اسباب کی بنا پر خود بخود ناقص مسلمان پیدا ہونگے، جیسا کہ آج کل ہے،

"اس تمثیل سے کافرانہ اور مشرکانہ اعمال کی حمایت اور حوصلہ افزائی بھی مقصد نہیں"، اور نہ یہ مقصد کہ ناقص اسلام یا ناقص مسلمانوں پر قناعت کرلی جائے، جیسا کہ خود "م" کی تمثیل سے ظاہر ہے، لیکن کسی مسلمان کی جانب کفر و شرک کی نسبت کرنے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے، فاسق اور گنہگار تک تو کہنے میں مضائقہ نہیں، لیکن جب تک کسی مسلمان سے صریح کفر کا صدور نہ ہو اس وقت تک اس کو کافر کہدینا بڑی جسارت ہے، بعض اکابر نے تو یہاں تک احتیاط کی ہے، کہ اگر کسی مسلمان میں ننانوے جہتیں کفر کی نکلتی ہوں، اور صرف ایک جہت اسلام کی ہو، تو اسے کافر نہ کہنا چاہئے،

اس سلسلے میں ایک اصولی سوال یہ ہے کہ اسلام اور ایمان کا صرف ایک ہی درجہ ہے یا مختلف مدارج ہیں، یعنی وہی مسلمان مسلمان کہلائے گا، جو ابوبکرؓ و عمرؓ وغیرہ اکابر صحابہ کا مثنیٰ اور اسلام کا مکمل نمونہ ہو، یا ناقص و گنہگار مسلمان بھی مسلمان ہی کہلائیں گے، اگر ایک ہی معیار ہے، تو تمام صحابہ کرام بھی ایمان و عمل کے لحاظ سے ایک درجہ کے نہ تھے، تو عام مسلمانوں کا کیا ذکر، ان بعض آیات اور بے شمار احادیث کا کیا جواب دیا جائے گا، جن میں گنہگار مسلمان کو مسلمان ہی کہا گیا ہے، اور ان پر مغفرت اور

نجات کے دروازے بند نہیں کئے گئے ہیں، اور ان کو معمولی معمولی اعمال پر بڑے بڑے اجر کی امید دلائی گئی ہے، اس مختصر جواب میں ان حدیثوں کے نقل کرنے کی گنجایش نہیں ہے، اور وہ اصحاب علم کی نگاہ میں ہوں گی، یہ بھی احادیث نبوی سے ثابت ہے کہ عہد رسالت کے بعد کے ساتھ مسلمانوں کی عملی حالت کمزور پڑتی جائے گی، لیکن کسی مسلمان کا تھوڑا عمل بھی بیکار نہ جائے گا، اس لئے کسی مسلمان کو کافر و مشرک کہنے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے، اسی کے ساتھ ناقص مسلمانوں کو کامل بنانے کی بھی پوری کوشش کرتے رہنا چاہئے، کہ یہی اسلام کا اصل مقصود اور ہر مسلمان کا مذہبی فریضہ ہے، "م"

حیاتِ شبلی

(حصہ اول)

مؤلفہ مولینا سید سلیمان ندوی

یہ نوسو صفحوں کی ضخیم کتاب صرف اس عہد کے ایک شخص کی سوانحعمری ہی نہیں، بلکہ درحقیقت مسلمانانِ ہند کے پچاس برس کے علمی، ادبی، سیاسی، تعلیمی، مذہبی، اور قومی تحریکات و واقعات کی تاریخ بن گئی ہے، اس سلسلہ میں بہت سے ایسے اشخاص کے مختصر حالات اور سوانح بھی درج ہوئے ہیں جن کو اس عہد کے سمجھنے کے لئے جاننا ضروری تھا، شروع میں ایک دیباچہ ہے جس میں جدید علمِ کلام کی نوعیت، اس کی حیثیت اور اس سے متعلق مولانا شبلی مرحوم اور اُن کے متقدمین و معاصر علماء کی علمی خدمات پر تبصرہ ہے، اس کے بعد ایک مفصل مقدمہ ہے، جس میں دیار مشرق میں علومِ اسلامیہ کی تعلیم و اشاعت کی تاریخ ہے، جو بڑی دیدہ ریزی سے یکجا ہوئی ہے، ضمناً ہر عہد کے مشہور اکابر علماء کے حالات بھی آگئے ہیں، اس کے علاوہ کتاب میں مولانا کے باقیات صالحات یعنی دار المصنفین، ندوة العلماء، مدرسة الاصلاح سرائے میر، اور شبلی ڈگری کالج کی عمارتوں کے ہاف ٹون بلاک فوٹو بھی شامل ہیں، کاغذ و طباعت اعلیٰ ضخامت ۹۲۰ صفحے قیمت غیر مجلد ہے، مجلد لیر "منیجر"

ادبیات

نعت

از جناب مائل خیرآبادی

زبان پر محمد کا نام آگیا ہے ... ہمیں آج لطفِ تمام آگیا ہے
دہان کی زمین خاک سے پاک سمجھو ... جہان ذکرِ خیرالانامؐ آگیا ہے
فرشتے جلو میں ادب سے کھڑے ہین ... یہ محشر میں کس کا غلام آگیا ہے
قدم کیا رسولِ معظمؐ کے آئے ... جہان میں مکمل نظام آگیا ہے
یہی بس ہے مائل ہمیں روزِ محشر ... وہ کہدین ہمارا غلام آگیا ہے

غزل

از جناب شاہین اشرف حجازی

مجھے نام ہی تمھارا ہے قرار جیتے جی کا ... کہ یہی ہے اک سہارا میری سانئی زندگی کا
مین فقیر ہون ٹھکانا نہین کچھ مری خوشی کا ... کہ ہے دو جہان سے بڑھ کر مجھے لطف زندگی کا
تمھین کس طرح بھلا دون یہ مجھے تمھین بتا دو ... کہ ہے تم پہ خود ہی روشن میرا حال بے کسی کا
ہے کبھی سے یاس مجھکو ہے تجھی سے آس مجھکو ... کہ مجھے نہین سہارا ہے ترے سوا کسی کا

جو ہجوم یاس پایا تو مُغیّس پکار اٹھا
یہی کام رہ گیا ہے بس اب اپنی زندگی کا

مطبوعاتِ جدیدہ

شرح میر درد از جناب خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۰۸ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد عہ، پتہ:۔ مکتبۂ ادب لال کنوان دہلی،

خواجہ میر درد علیہ الرحمہ کی شہرت زیادہ تر شاعر کی حیثیت سے ہے، لیکن درحقیقت وہ ایک صاحب نسبت اور صاحب دل صوفی تھے، ان کی شاعری ان کے باطنی جذبات کے اظہار کا ذریعہ تھی، ان کا کلام نہایت سادہ اور سلیس ہے، لیکن تصوف کے معارف و حقائق سے لبریز ہے، اس لئے جو لوگ اس بادہ کی لذت شناس نہیں ان کو جا بجا سمجھنے مین دقت پیش آتی ہے، خواجہ صاحب نے اس کی شرح لکھ کر ایک بڑی ضرورت پوری کی ہے، اب تک یہ نہین معلوم تھا کہ خواجہ صاحب اس کوچہ سے بھی آشنا ہین، ہم نے اس شرح کو اکثر مقامات سے دیکھا، اور صحیح پایا، یہ اس سرزمین سے نسبت کا فیض ہے، جو صدیوں تصوف کا گہوارہ رہ چکی ہے، اور جہان آج بھی بہت سے اکابر مشائخ و صوفیاے کرام آسودہ خواب ہین، مصنف مین زبان کی فصاحت و پاکیزگی اتنی رچی ہوئی ہے، کہ اُن کے قلم کی کوئی تراوش اس سے خالی نہین ہوتی، چنانچہ اس شرح مین بھی زبان کی لطافت نمایان ہے، یہ شرح اصحاب ذوق کے مطالعہ کے لائق ہے،

ہندوستان کی سیاسی الجھنین، مترجمہ جناب شاہین فاروقی تقطیع اوسط ضخامت ۲۲۷ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت:۔ ۱۲/عہ پتہ نفیس اکیڈمی عابد روڈ حیدرآباد دکن،

کانگریس کے اجلاس کوکن ڈا (۱۹۲۱ء) کا مولانا محمد علی مرحوم کا خطبۂ صدارت بڑا معرکۃ الآرا تھا، اس مین اس دور کے ہندوستان کے تمام سیاسی مسائل پر جن مین ہندو مسلمانون کے اختلافات بھی ہین،

نہایت مبصرانہ نگاہ ڈالی گئی ہے، اور اُن کا حل پیش کیا گیا ہے، اصل خطبہ انگریزی زبان میں ہے، اور اس میں مولانا مرحوم کے زورِ بیان اور ادب و انشا، کی تمام خوبیاں موجود ہیں، جناب شاہین فاروقی نے اس کا ترجمہ کیا ہے، گو اتنی طویل مدت میں بڑا انقلاب ہو چکا ہے، سیاست کی دنیا ہی بدل گئی ہے، ہندوستان آزاد ہو چکا ہے اس لئے اس خطبہ کی بہت سی باتیں قصہ پارینہ بن چکی ہیں، لیکن ہندو مسلم مسائل اور ان کے اتحاد کے بارہ میں آج بھی اس خطبہ سے مدد مل سکتی ہے، اور اسی نقطہ نظر سے اس کا ترجمہ شائع کیا گیا ہے، ترجمہ شگفتہ اور سلیس ہے، لیکن اس پر جو مقدمہ اور کتاب پر جا بجا جو نوٹ ہیں، وہ نہ صرف اس ترجمہ کے مقصد کے منافی بلکہ نہایت نامناسب ہیں، آج کل سیاسی تغیرات کی تیز رفتاری کا یہ حال ہے، کہ چند مہینے پہلے تک جو سیاست تھی وہ اب بالکل بدل گئی ہے، اور برابر بدلتی جائے گی، ان حالات میں جو خیالات مقدمہ میں ظاہر کئے گئے ہیں ان کی اب قطعًا کوئی گنجائش نہیں، "امن کی راہ کی" "تلاش میں" "فریب کاری" کی بدامنی کی دعوت کس قدر متضاد ہے،

اَن پڑھ ہندوستان مترجمہ جناب سید ملا فخر الدین صاحب بی اے بی ٹی، لکچرار عثمانیہ ٹرننگ کالج حیدرآباد، تقطیع اوسط ضخامت ۲۵۰ صفحے، کاغذ کتابت بہتر، قیمت درج نہیں، پتہ ادارہ اشاعت اردو حیدرآباد دکن،

ہندوستان میں جہالت اتنی عام ہے، کہ اس کی پوری تعلیم کے لئے ایک مدت درکار ہے، اس کا وقتی علاج صرف تعلیم بالغان ہے، جس کے ذریعہ بقدر خواندگی تعلیم عام ہو سکتی ہے، ہندوستان میں جا بجا اس کے کامیاب تجربے کئے گئے ہیں، پروفیسر فرینک سی لاخ جنھیں تعلیم بالغان کا وسیع تجربہ ہے، اور ہندوستان کے تجربات سے بھی ان کو پوری واقفیت ہے، اس موضوع پر یہ جامع کتاب لکھی تھی، اس میں تعلیم بالغان کی اہمیت و ضرورت، ہندوستان میں اس کے تجربات و نتائج، اس کے نصاب و تعلیم کے طریقوں، اور ان تمام تعلیمی اور عملی وسائل و ذرائع کو جو تعلیم بالغان کے لئے مفید اور کارآمد ہو سکتے ہیں، نہایت بسط و شرح

کے ساتھ بیان کیا ہے، یہ کتاب اس موضوع سے تعلق اور دلچسپی رکھنے والوں کے مطالعہ کے لائق ہے، ترجمہ صاف اور سلیس ہے،

غدر دہلی کے افسانوں کا سلسلہ، مرتبہ شمس العلماء جناب خواجہ حسن نظامی، ۱۲ حصے، قیمت مجموعی گیارہ روپے، پتہ دفتر لوح محفوظ، اردو لائبریری دہلی،

خواجہ حسن نظامی صاحب کے مرتب کردہ غدر دہلی کے افسانوں کا سلسلہ اتنا مشہور اور مقبول ہے، کہ اس کے لئے کسی نئے تعارف کی ضرورت نہیں، یہ سلسلہ اب سے پچیس تیس سال پہلے شروع ہوا تھا، اور اتنا مقبول ہوا کہ اس کے کئی اڈیشن نکل چکے ہیں، اور ہر اڈیشن میں نئے معلومات کا اضافہ ہوتا رہا، بعض مستقل کتابوں کا بھی اضافہ ہوا، ان میں سے اکثر حصے خواجہ صاحب کی مستقل تالیف ہیں جو انھوں نے دہلی کے پرانے لوگوں سے سن کر لکھے، اور بعض غدر کے زمانہ کے ..... روزنامچوں خطوط اخبارات، اور سرکاری کاغذات و بیانات سے ماخوذ ہیں، یہ کل ۱۲ حصے ہیں، بیگمات کے آنسو، انگریزوں کے قصے، محاصرہ دہلی کے خطوط، بہادر شاہ کا مقدمہ، غدر کے فرمان، غدر دہلی کے اخبار، غالب کا روزنامچہ، دہلی کی جان کنی، بہادر شاہ کا روزنامچہ غدر کی صبح و شام، دہلی کی آخری شمع، دلی کی سزا، گیارہواں حصہ مرزا فرحت اللہ بیگ کا لکھا ہوا مشہور معروف دلی کا آخری مشاعرہ ہے،

نکتہ چین ہے غم دل، مترجمہ جناب آغا افتخار حسین صاحب بی اے، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۲۸ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت فی جلد ۱ روپے، پتہ بر نفیس اکیڈمی، عابد روڈ حیدرآباد دکن،

یہ کتاب برنارڈ شاہ کے مشہور ڈرامے "مین اینڈ سپر مین" کا ترجمہ ہے، جس میں ایک شعبدہ گر اور عشوہ طراز عورت اپنے شاعر مزاج اور بھولے عاشق کو محبت کے فریب میں مبتلا رکھ کر ایک دوسرے خوش مزاج بذلہ سنج اور چرب زبان نوجوان سے جو بظاہر اس سے بھاگتا ہے، لیکن دل میں اس کی محبت چھپائے ہے، شادی کر لیتی ہے اس ڈرامے میں برنارڈ شاہ کی تمام خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہیں، اور اس زمانہ کے بہت سے سیاسی اقتصادی اور معاشرتی نظریات و مسائل اور جدید دور کی بعض خوشنما اور پر فریب اصطلاحوں اور سائنس و آرٹ اور بعض

دوسرے عقائد و خیالات پر نہایت فلسفیانہ انداز مین نقد و تبصرہ کیا گیا ہے، ترجمہ سلیس و شگفتہ ہے،

تلقینِ حق از جناب پروفیسر سید نواب علی صاحب تقطیع چھوٹی ضخامت ۹۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت معمولی، قیمت ۱۰ر، پتہ ادارہ تعلیمات اسلامی نمبر ۱۳۸، امین آباد پارک لکھنؤ،

فاضل مصنف کی نگاہ قدیم مذاہب اور ان کے صحیفون پر بڑی گہری اور وسیع ہے، اس رسالہ مین انھون نے مختلف عقائد کے بارہ مین ان مذاہب کی تعلیمات اور بعید از عقل افسانون کے مقابلہ مین اسلام کے عقائد و تعلیمات، اس کی توحید، دوسرے صحیفون کے مقابلہ مین کلام مجید کی خصوصیات وحی، کلام مجید کے ممتاز اور نمایان مضامین احکام، اہلِ مذاہب سے مناظرہ، گذشتہ امتون کے سبق آموز حالات عجائبات عالم مین تفکر کی دعوت اور ان سے استدلال حیات بعد الممات اور جزا، و سزا وغیرہ اسلام کے ارکان خمسہ، توحید، نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کی حکمتون کو ایسے دلنشین انداز مین بیان کیا ہے، جن سے دوسرے مذاہب کی تعلیمات کے مقابلہ مین اسلام کی تعلیمات کی سادگی دلنشینی صداقت اور برتری کا اندازہ ہوتا ہے، گو یہ کتاب طالب علمون کے لئے لکھی گئی ہے، لیکن ہر شخص کے مطالعہ کے لائق ہے،

سفینہ جناب شفیق جونپوری تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۴۴ صفحے کاغذ کتابت و طباعت اوسط قیمت ۱؍۱۲، پتہ نسیم بک ڈپو، و انوار بک ڈپو، لکھنؤ، و سکریٹری بزم ادب جونپور،

مصنف کے کلام کی شہرت محتاج تعارف نہین اُن کے کلام کے کئی مجموعے چھپ کر مقبول ہو چکے ہین، سفینہ نیا مجموعہ ہے، اس مین غزلیات کے علاوہ مذہبی اخلاقی اور قومی نظمین بھی ہین، اور ان سب مین کلام کی پختگی، خیالات کی پاکیزگی، زبان کی نفاست اور انداز بیان کی دل آویزی نمایان ہے امید ہے کہ یہ مجموعہ اصحاب ذوق مین مقبول ہوگا،

جلد ۶۱ ماہ ربیع الاول ۱۳۶۷ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۴۸ء عدد ۲

مضامین

مقالات

استفسار و جواب

وفیات

ادبیات